ماہنامہ انٹرنیشنل لاہور

اگست
2019

چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت ''انگریزی'' اور ''اردو'' زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

عمران خان کا امریکی دورہ

ایک بڑی کامیابی

صفحہ نمبر 7

www.lahoreinternational.com

Guru Nanak Dev Ji's 550th Birthday Celebration

JOURNEY TO KARTARPUR & SULTANPUR LODHI
for WORLD PEACE

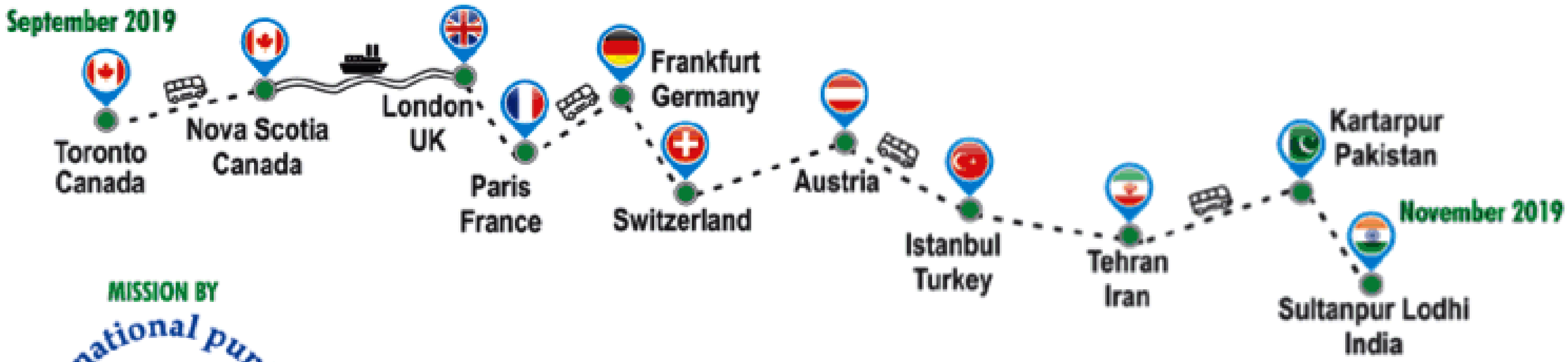

MISSION BY
international punjabi foundation
ipf
ipfcanada.org

Sponsored by

JobsInGTA.com

For sponsorships info
001-437-770-1313

JobsInGTA

- Search jobs
- Apply easily
- Get hired quickly

Sign up, create your profile and start applying... **IT'S THAT EASY!**

www.JobsInGTA.com

اس شمارہ میں

4	درس القرآن
5	اداریہ
7	عمران خان کا امریکی دورہ ایک بڑی کامیابی
9	تاریخی درس گاہ "سندھ مدرسۃ الاسلام"
12	جنرل جان جیکب کا جیکب آباد بدل چکا
14	"حسن یوسف اور مولوی غلام رسول عالپوری"
16	پاکستان میں احمدیوں کی زندگی: 'ہمارے گھر میں خوف کی فضا بھی'
19	جھوٹے مسلمان، جھوٹے پاکستانی!
21	جعل سازی کے امکانات روشن ہو گئے
23	جب گوجرانوالہ کے شہریوں پر برطانوی جہازوں نے بمباری کی
27	سی ایس ایس کی تیاری
29	لاہور اپنا اپنا!
32	جانے کہاں گئے وہ دن!!!
33	پھوٹی کوڑی
35	یہ سب قوم پرست اور تعصبی ہیں
36	خصوصی انٹرویو میمونہ حسین سینئر رہنما پاکستان تحریک انصاف کے ساتھ
39	کچھ پریس کانفرنس کی زبانی۔۔۔۔
41	سردار عبدالرب نشتر
44	سندھ میں ہٹلر کلچر
45	عاطف میاں: 'مالیاتی بحران کی بنیادی وجہ کرپشن سے زیادہ بیرونی قرضوں کا؟
47	کینیڈین سیاستدان کی ملالہ کے ساتھ تصویر زیر بحث کیوں؟
48	آسٹریلیا: دو وہزار سالہ کیتھولک رسم قانون کی زد میں
50	برطانیہ کے بادشاہ نے اپنے کزن زار روس کو کیسے دھوکہ دیا
53	امریکا میں "اوسلو"
54	جوا، شراب اور ویڈیو گیمز: انسان کو کسی چیز کی لت کیوں اور کیسے لگتی ہے؟
55	صحیح مذہب اور صحیح سائنس کا ٹکراؤ ممکن نہیں
57	مسجد کے امام اور استغفار پسند عوام
58	کتاب اور دنیا برتنے کا فن
59	تیونس کی حکومت نے سرکاری عمارتوں میں نقاب پہننے پر پابندی عائد کردی ہے
60	شعروشاعری
62	اداسیاں ویرانیاں مرے اندر کی دیکھ کر مجھے کسی نے بتایا ہے مرگیا ہوں میں
64	آدمی عورت سے محبت کرتا ہے جبکہ عورت اولاد سے
65	عشق بے کار نہیں

ADVERTISEMENT TARIFF
(Effective : January 01, 2018

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ
ھُوَالـــــــنـــاصر
بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل
لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد 2 شمارہ نمبر 8 ذوالقعدہ 1440ھ اگست 2019

زیر انتظام
عباسی اکیڈیمی

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

انچارج بزم خواتین
بشریٰ بختیار خان

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

انچارج بزم اطفال
عیشۃ الراضیہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
+47-91698367

عرفان احمد خان (جرمنی)
+49-1711974701

ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
+49-15212005548

محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
+41-64333112

بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
+92-3327051887

حاجی میاں محمد وقار یعقوب
(نمائندہ جنوبی پنجاب پاکستان)
+93-300-6912-273

روحان احمد طاہر (پاکستان)

چوہدری مقبول احمد (بھارت)
+91-9988489365

ابن الامین (برطانیہ)
+44-7940077825

قیمت فی شمارہ: 2 پاؤنڈ

website: lahoreinternational.com

اپنی قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com
m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے۔
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

درس القرآن

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔

(سورۃ الحج آیت نمبر 27-28)

اور جب ہم نے ابراہیم کے لئے خانہ کعبہ کی جگہ بنائی (یہ کہتے ہوئے کہ) میرا کسی کو شریک نہ ٹھہرا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں (اور) سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک وصاف رکھ۔ اور لوگوں میں حج کا اعلان کردے وہ تیرے پاس پاپیادہ آئیں گے اور ہر ایسی سواری پر بھی جو لمبے سفر کی تکان سے دبلی ہوگئی ہو وہ (سواریاں اور چیزیں) ہر گہرے اور دور کے رستے سے آئیں گی۔

تفسیر: اللہ تعالیٰ کا یہ تاکیدی حکم ہے کہ حجِ بیت اللہ کے لئے آنے والوں کو خانہ کعبہ تک پہنچنے سے ہرگز نہ روکو۔ اس کے معاًبعد بیت اللہ کا ذکر ہے اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے جو تاکید فرمائی ہے اس کا ذکر ہے کہ میرے گھر کو ہمیشہ حج پر آنے والے اور اعتکاف کرنے والے کی خاطر پاک وصاف رکھو۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو یہ تاکید کی گئی یہ صرف آپ کی ذات کو نہیں بلکہ آپ کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کو قیامت تک کے لئے ہے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تمام بنی نوع انسان کو حج کی غرض سے خانہ کعبہ آنے کے لئے ایک دعوتِ عام دو۔ اس کے بعد قربانیوں وغیرہ کا ذکر فرمایا گیا کہ وہ بھی خانہ کعبہ کی طرح شعائر اللہ میں داخل ہیں، اگر اُن کی بے حرمتی کروگے تو گویا خانہ کعبہ کی بے حرمتی کروگے۔ لیکن خانہ کعبہ کی خاطر کی جانے والی ساری قربانیاں اس وقت قبول ہوں گی جب تقویٰ کے ساتھ کی جائیں گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کو نہ تو قربانیوں کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون بلکہ محض قربانی کرنے والوں کا تقویٰ پہنچتا ہے۔

(قرآن کریم اردو ترجمہ صفحہ نمبر 559 حضرت مرزا طاہر احمد)

بیت اللہ کی تعمیر کے موقعہ پر حضرت ابراہیمؑ نے سات دعائیں کی ہیں۔

1۔ جب عمارت بنائی۔ باپ بیٹا مل کر دعا کرتے تھے۔ (بقرہ:129)

الٰہی ہمیں اپنا فرماں بردار بنالے۔

2۔ (بقرہ:129) 3۔- 4۔(بقرہ:129) پھر دعا کی۔ 5۔- 6۔ - 7۔(بقرہ:130)

کل بناء کعبہ میں سات دعائیں کی ہیں۔ اس واسطے مومن سات دفعہ وہاں طواف کرتا ہے اور یہ دعائیں کرتا ہے۔ اسی مقام کو ڈھونڈتا ہے جہاں یہ دعائیں قبول ہوئیں۔

(حوالہ حقائق الفرقان جلد سوم صفحہ 146)

حدیث

ایک دفعہ ایک یہودی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر والی آیت ہماری کتاب میں موجود ہوتی تو ہم اس آیت کے نزول کے دن کو اپنے لئے عید کا دن مقرر کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم تو ایک دن عید مناتے تھے لیکن ہمارے لئے تو جس دن یہ آیت نازل ہوئی تھی دو عیدیں جمع تھیں۔ ایک جمعہ کا دن تھا اور دوسرے حج کا دن تھا۔

(ترمذی جلد 2 کتاب التفسیر)

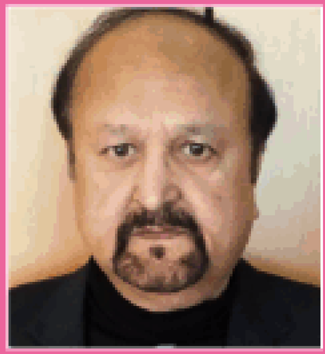

مدیر اعلیٰ: محی الدین عباسی

کیا ناموسِ رسالت پر سیاست کرنا درست ہے؟

یہ قصہ نیا نہیں، پرانا ہے دوستو! بس بھیس بدل بدل کر سامنے آتا رہتا ہے۔

لاہور کے ایک ہندو، راج پال نے 1923ء میں ایک کتاب لکھی۔ کسی بھی مذہب کی کسی بھی مقدس ہستی، نشانی، عبادت گاہ وغیرہ کی تقدیس دوسرے مذاہب کے لوگوں پر بھی فرض ہوتی ہے اور انسان نے تاریخ میں منظم معاشرے کی بنیاد اسی اکٹھے مل جل کر رہنے کے لئے رکھی تھی۔ خیر، اس کتاب نے مسلمانانِ ہند میں طوفان برپا کر دیا اور مختلف مسلم اور غیر مسلم رہنماؤں نے اپنے اپنے دائرہ میں اس کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ مسلمانانِ ہند کی جانب سے اس معاملے پر آگے بڑھنے والوں میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب بھی تھے۔ جو برصغیر میں بہترین مقرر تھے۔ انہوں نے بھی راج پال، اس کی کتاب کے خلاف اور رسول اللہ آقا محمد ﷺ کی شان کے حق میں شعلہ بیاں تقاریر کیں۔ ان کی اسی زمانے کی تقاریر کا ایک حوالہ کچھ اس طرح تھا کہ: **''جنت کے دریچوں میں حضرت عائشہؓ شدتِ غم اور اداسی کی کیفیت میں ہیں، ہے کوئی جو میرے اور اللہ کے محبوب ﷺ کی توہین کا بدلہ لے''۔**

اس بیان نے ایک منظر اور ماحول بہر حال بنانا ہی تھا، بنا ڈالا جس کے نتیجہ میں متاثر ہو کر جناب علم دین جو کہ لاہور میں ایک بڑھئی کے بیٹے تھے اور شاید اپنے ابا کے ہاں ہی مزدوری کرتے تھے۔ راج پال کو چھری گھونپ دی راج پال قتل ہو گیا اور علم دین کو جیل ہو گئی۔ مقدمہ بنا علم دین کا مقدمہ قائداعظم محمد علی جناح نے ڈاکٹر (علامہ) اقبال کی فرمائش پر لڑا ہار گئے اور یوں 31 کتوبر 1929ء کو علم دین کو میانوالی جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ پھانسی پر لٹکتے وقت، علم دین صاحب کی عمر 20 سال 10 مہینے اور 26 دن تھی۔ ان کی پھانسی پر ڈاکٹر علامہ اقبال نے یہ مشہور فقرہ بھی کہا جو پاکستان میں مذہب کی مقبول تاریخ کا حصہ ہے۔

''اسی گلاں کردے رہ گئے، تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا!''

اس ضمن میں چند ایک سوالات ہیں آپ سب کی سوچ کی نذر اور مجھے معلوم ہے کہ آپ سے 90 فیصد کو ان کے جوابات معلوم نہیں

☆ علم دین کے والد صاحب کا کیا نام تھا اور وہ کتنے بہن بھائی تھے؟

☆ علم دین کی پھانسی کے بعد ان کے خاندان پر کیا بیتی اور ان کے کیا حالات رہے؟

☆ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ علم دین کی والدہ فوت ہو چکی تھیں، اگر میرا حوالہ غلط ہے تو بتایئے کہ علم دین کی والدہ پر ان کی پھانسی کے وقت کیا بیتی، اور بعد ازاں ان کی حیات کیسی رہی؟

☆ علم دین کے جنازہ پر آنے والوں نے بعد ازاں کتنی مرتبہ جا کر ان کے والد اور باقی خاندان کی خیر خبر لی، یا ان کو ہندو اکثریت کے مقابلے میں ایک علامت کے طور پر ہی جوابی جارحانہ بیانیہ میں استعمال کیا جاتا رہا؟

اور دو ضمنی سوالات کہ راج پال کو چھری سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب یا ڈاکٹر اقبال صاحب نے کیوں نہ گھونپی، حالانکہ ان میں سے ایک تو خود سادات کی لڑی میں سے تھے، اور دوسرے مفکر اسلام جانے جاتے تھے؟

کیا انہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صدا پر جواب دینا نہ آتا تھا، یا وہ دونوں احباب عمر کے اس حصہ میں تھے کہ جہاں اپنے اپنے دائرے میں اپنی شخصیت کے سیاسی، سماجی اور معاشی مفادات اہم ہوتے ہیں؟

میری کچھ رہنمائی کریں کہ علم دین صاحب کے اس عمل پر بلبل ہند، جناب مولانا ابوکلام آزاد کا کیا موقف تھا؟ ان کے حوالہ جات، تقسیم ہند کے حوالے سے تو کافی سننے کو ملتے ہیں، کچھ گستاخ رسول، ناموس رسالت کے حوالے سے بھی ان کا ذکر ہو ہی جائے!

2006ء کی بات ہے۔ جرمنی کی حکومت کی جانب سے وظیفہ پر گئے عامر عبدالرحمٰن چیمہ نے جرمن اخبار، ڈائی ویلٹ کے ایڈیٹر راجر کاپل کو مارچ کے مہینے میں اس کے دفتر میں گھس کر قتل کرنے کی کوشش کی کیونکہ راجر کاپل نے ڈنمارک میں شائع ہونے والے آقا محمد ﷺ کی شبیہ شائع کر دی تھی۔ عامر چیمہ پکڑے گئے اور جیل میں پراسرار حالات میں ان کی زندگی اختتام کو پہنچی۔ میرے خیال میں ان پر تشدد کیا گیا ہوگا مگر حتمی وجہ معلوم نہیں ہو سکی آج تک۔ خیر ان کی نعش کو 21 مئی 2006ء کو وزیر آباد تحصیل میں سادھوکی کے مقام پر دفنا دیا گیا۔ ایک صحافی دوست نے اس جنازے کی کوریج کی اور بتایا تھا کہ ان کے جنازے پر اس وقت کے جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد مرحوم کی نمائندگی محترم منور حسن کر رہے تھے۔ دوسری طرف جمیعت علمائے پاکستان کے نمائندگان بھی موجود تھے، فریقین کے درمیان اس بات پر تلخ کلامی بھی ہوئی تھی کہ عامر کا جنازہ کون پڑھائے گا چونکہ دونوں کو مکتبہ فکر کا مسئلہ تھا۔ دفنانے کے بعد، ان احباب نے پلٹ کر کوئی خبر نہیں لی ہوگی پروفیسر چیمہ صاحب کی۔ اس سوال کا جواب آپ پر چھوڑتا ہوں۔ اسی مقامی صحافی نے چیمہ صاحب کی بہنوں اور پھپھیوں کے بین کے بارے میں بھی بتایا اور یہ کہ پروفیسر چیمہ صاحب اپنے بیٹے کی موت پر ٹوٹے اور بکھرے ہوئے تھے، مگر وطن عزیز میں مذہب کی سماجیات ان کے بیٹے کی نعش کے جنازے میں جھگڑ رہی تھی۔ پروفیسر نذیر چیمہ اس وقت کس حال میں ہوں گے؟ ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں اور نہ ہی

کسی نے کبھی کوئی پروا کی ہوگی۔ پروا اگر ہوگی تو عامر کی بہنوں اور اگر ان کے والدصاحب ابھی زندہ ہوتے تو انہیں ہوتی۔

قاتل ممتاز قادری کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی رہے گا جو آج اسلام آباد بریلوی بھائیوں کے تشدد کے خوف کے سائے تلے رینگ رہا ہے۔

علم دین، عامر چیمہ اور ممتاز قادری۔ کیا اپنے تئیں ناموس رسالت آقا محمد ﷺ کی حفاظت کے لئے تشدد اور قتل کرنا ضروری تھا؟ اور اگر ضروری تھا تو یہ کام مذہب وملت، اور مذہب کی بنیاد پر سیاست کرنے والے، عظیم رہنماؤں یا ان کے بچوں نے کیوں نہ کیا؟

علم دین، عامر چیمہ اور ممتاز قادری اور ان جیسے دیگر افراد کے مذہبی تشدد کو آقا محمد ﷺ کی ناموس کی ضمانت سمجھنے والوں سے پوچھنا یہ بھی ہے کہ کیا قتل کرنے سے میرے آقا کملی والے ﷺ کی شان میں اضافہ ہوا ہوگا؟ کیا اس تشدد نے اسلام کا امیج غیر مسلموں کی نظر میں بہتر بنایا ہوگا؟

ایک سوال خود سے بھی پوچھئے کہ وطن عزیز پاکستان میں مذہب کے عمومی متشدد سماج میں رہنے والے مسلمان، دوسرے مذہب کی کتب، شخصیات اور عبادت گاہوں کے بارے میں اپنے دل میں کیا جذبات رکھتے ہیں؟ میرے گنہگار کانوں نے خود کئی مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں ہندوؤں، مسیحیوں اور یہودیوں کی بربادی کی دعائیں سنی ہیں اور بے شمار مرتبہ ان کی کتب کے بارے میں ایسا ہی پڑھا اور سنا ہے۔

اور ہاں علم دین، عامر چیمہ اور ممتاز قادری، مذہب کی سماجیات میں عمومی بیانیہ سے متاثر ہوکر جذباتی تشدد کرتے وقت اپنی اپنی عمروں کی تیسری دہائی میں تھے وہ کرگزرے۔ ان کے پسماندگان پر کیا گزری کسی کو معلوم نہیں کسی کو پروا نہیں اور یہی سچ ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں کہ کسی کو پروا نہیں جنہوں نے ان کے جنازوں پر گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگائے اور واپس آکر اپنی دکان پر ریڈیو لگالیا، کیبل پر انڈین فلم دیکھ لی اور انٹرنیٹ پر سیاسی تبصروں میں مشغول ہوگئے! لیکن ان تمام میں سے سب سے زیادہ فائدہ خادم حسین رضوی کو ہوا۔ آج یہ تناور درخت بن گیا ہے اور اس کی شاخیں پھیل چکی ہیں۔ یہ چوتھی بڑی سیاسی جماعت بن کر ابھری ہے۔ 2018ء کے الیکشن میں اس کی جماعت نے 22 لاکھ سے زائد ووٹ حاصل کئے ہیں۔ اس کا پسِ منظر اور گالیوں والے ملّا سے متعلق کچھ حقائق یہ ہیں۔

خادم حسین رضوی چند برس قبل ایک مولوی کے روپ میں نمودار ہوئے جو منبر پر بیٹھ کر لوگوں کو گالیاں دیتے اور اپنے حامیوں سے داد وصول کرتے۔ ان کو پسند کرنے والوں نے جب ان کی ویڈیوز سوشل میڈیا پر شیئر کرنی شروع کیں تو اکثر لوگوں نے صرف اس لئے یہ ویڈیوز دیکھیں کہ کوئی مذہبی شخص منبر پر بیٹھ کر کس طرح گالیاں نکالتا ہے۔ لیکن اب وہ علامہ اور بڑے بڑے القاب کا روپ دھار چکے ہیں۔ جس سے بڑی بڑی جماعتیں خوفزدہ ہیں۔ لیکن وہ اور ان کی جماعت گم نامی اور اندھیروں کے پیچھے چلہ کشی کر رہے ہیں کیونکہ ان کی ناموس رسالت پر سیاست کرنے والی سیاست نے ایک تحریری معافی نامہ نے ان کو خاموش کر دیا ہے۔

بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے موصوف ملا نے اس وقت عروج حاصل کیا جب 2011ء میں گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو اس کے اپنے پولیس گارڈ ممتاز قادری نے قتل کر دیا۔ موصوف ملّا نے اس اقدام کو درست قرار دیا پھر اس کی وجہ سے انہیں محکمہ اوقاف کی نوکری سے فارغ کر دیا۔ جب ممتاز قادری کو پھانسی لگی تو اس نے آرمی چیف راحیل شریف اور وزیر اعظم نواز شریف کو گالیاں دیں۔ فیض آباد دھرنے کا سودا 42 کروڑ میں طے پایا موصوف ملّا نے 21 کروڑ وصول کرنے کے بعد ختم کر دیا۔ دوسرے گروپ کو بقایا رقم نہیں ملی تو وہ سڑکوں پر آ گئے۔

ہائی کورٹ میں حکومتی وکیل کا موقف تھا کہ یہ نہ تو ملازمت کرتا ہے نہ ہی کوئی اس کا ذریعہ معاش ہے لیکن کروڑوں کا مالک ہے۔ اس پر سوالیہ نشان ہے؟ اس ضمن میں ہائی کورٹ میں کیس زیر التواء ہے۔

یاد رہے افغانستان میں جہاد کے آغاز سے پاکستان میں دیوبندی مکتبہ فکر کے مدارس اور علماء کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ بریلوی فرقہ کے نمایاں رہنما شاہ احمد نورانی اور عبدالستار خان نیازی کے بعد بریلوی طبقہ مختلف گروپوں میں بٹ گئے جن میں سے ایک خادم حسین رضوی کی شکل میں سیاسی منظر نامے میں آ گئے۔ ویل چیئر تک محدود ہونے کے باوجود یہ پاکستان میں متنازع توہین کے قانون کے ایک بڑے حامی بن کر سامنے آئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے مذہبی سیاست کا اتنا بڑا کاروبار کس طرح قائم کیا ہائی کورٹ میں جرح کے دوران حکومتی وکلاء بھی اس کا تسلی بخش جواب نہ دے سکے لیکن کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے اس الیکشن میں ایک بھرپور مہم چلانے اور اس کی جماعت کو مضبوط کرنے میں کن اداروں اور اہم ملکی شخصیات کا ہاتھ ہے یہ سوال توجہ طلب ہے جب عدالت حقیقی معنوں میں اس کا احتساب کرے گی تو اصل وجہ سامنے آجائے گی ورنہ جو لوگ اس مقدس نام کی حرمت پر سیاست کر رہے ہیں ایک دن اس کا حساب دینا ہوگا۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے جب چلے گی تب سارے معافی مانگتے نظر آئیں گے۔

دل خوف خدا سے خالی ہیں ہوتی ہے تجارت مذہب کی
مذہب کے اجارہ داروں کو آئینہ ذرا دکھلانے دو

عمران خان کا امریکی دورہ ایک بڑی کامیابی

تحریر عدنان خان کاکڑ

عمران خان کے امریکی دورے سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں تھیں۔ جب یہ خبریں آنے لگیں کہ اس دورے کی دعوت شہزادہ محمد بن سلمان کے توسط سے لی گئی ہے تو توقعات مزید کم ہو گئیں۔ مگر جس طرح امریکی صدر ڈانلڈ ٹرمپ نے مسئلہ کشمیر کی ثالثی کی پیش کش کی ہے، بلکہ یہ کہہ کر نریندر مودی کو شدید مشکل میں مبتلا کر دیا ہے کہ ثالثی کی یہ خواہش نریندر مودی کی جانب سے ظاہر کی گئی ہے، اس کے بعد صورت حال مختلف دکھائی دے رہی ہے۔ باقی کسر صدر ٹرمپ نے نئے پاکستان کے واری صدقے جا کر پوری کر دی ہے۔

بھارتی پردھان منتری نریندر مودی کے دور میں ہند امریکہ تعلقات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ نے ہندوستان کو اپنے جدید ترین ہتھیاروں کی پیش کش بھی کی ہے۔ صدر ٹرمپ کا فوکس معیشت پر ہے اور بھارت دنیا کی ایک بڑی منڈی ہونے کی وجہ سے امریکہ اور باقی دنیا کے لئے دن بدن اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس تناظر میں پاکستان سے تعلقات کو فوقیت دیتے ہوئے یہ بیان دینا بہت زیادہ اہم ہے۔

ہندوستان کا شملہ معاہدے کے بعد سے یہی موقف رہا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ دونوں ممالک باہمی طور پر حل کریں گے اور اس میں کسی تیسرے فریق کو شامل نہیں کیا جائے گا۔ ایسے میں ٹرمپ کا یوں کہنا کہ نریندر مودی نے دو ہفتے پہلے اوساکا کی جی ایٹ کانفرنس میں کشمیر کے معاملے پر ثالثی کرنے کا کہا ہے، نریندر مودی کے لئے شدید پریشانی کا باعث بنا ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ نریندر مودی اس بات کو مانیں گے کہ انہوں نے ایسا کہا تھا اور وہ ہندوستان کے دیرینہ موقف کے خلاف تیسرے فریق کو شامل کرنا چاہتے ہیں، یا پھر وہ یہ کہیں کہ صدر ڈانلڈ ٹرمپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ انہوں نے دوسری بات کا انتخاب کیا اور چند گھنٹے کے اندر اندر ہی بھارتی وزارت خارجہ نے ٹویٹ کی کہ بھارتی وزیر اعظم نے ایسی کوئی درخواست امریکی صدر سے نہیں کی، پاکستان سے تمام تصفیہ طلب امور باہمی طور پر زیر بحث لائے جائیں گے جس کے لئے شرط یہ ہے کہ پاکستان سرحد پار دہشت گردی بند کر دے، اور پاکستان اور انڈیا کے درمیان معاملات شملہ معاہدے اور اعلان لاہور کے تحت حل کیے جائیں گے۔

اب صدر ٹرمپ کے ماضی کو دیکھتے ہوئے یہ توقع ہے کہ وہ اپنے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو ایک طرف کر کے براہ راست ٹویٹ کے ذریعے ہی ان نابکاروں کی سرکوبی کریں گے۔ ستمبر میں نریندر مودی نے نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرنے امریکہ جانا ہے اور وہ ہوسٹن میں ہندوستانیوں سے خطاب بھی کریں گے۔ ان کے دورے میں ابھی تک واشنگٹن شامل نہیں مگر دونوں ممالک کے قریبی تعلقات کو دیکھتے ہوئے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ ان کی صدر ٹرمپ سے ملاقات بھی ہو گی۔ اب ٹرمپ کو جھوٹا قرار دینے کے بعد نہ جانے کیا ہو گا۔

بہر حال جس طرح عمران خان اور ڈانلڈ ٹرمپ کی بات چیت ہوئی ہے اور ٹرمپ نے کہا ہے کہ عمران خان پاکستان کے مقبول ترین لیڈر ہیں۔ انہوں نے عمران خان کو سامنے بٹھا کران کے اور پاکستان کے قصیدے پڑھے۔شاہ محمود قریشی نے بتایا ہے کہ صدر ٹرمپ نے وزیر اعظم عمران خان کی طرف سے دی جانے والی پاکستان کے دورے کی دعوت بھی قبول کر لی ہے۔صدر ٹرمپ نے بتایا کہ عمران خان کے حکومت سنبھالنے سے پہلے پاکستان تعاون نہیں کر رہا تھا لیکن اب بہت کر رہا ہے۔ بظاہر یہ لگ رہا ہے کہ دونوں لیڈروں میں یہ طے ہوگیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی پریشانیاں ایک دوسرے کے سپرد کر کے نچنت ہو جائیں۔ بہر حال مسئلہ کشمیر کے بارے میں تو نائن الیون کو صدر بش کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے جنرل پرویز مشرف نے بھی یہی اعلان کیا تھا کہ امریکہ افغانستان میں تعاون اور بھارت کو باڑ لگانے کی اجازت دینے کے بدلے مسئلہ کشمیر حل کروادے گا۔ دیکھتے ہیں اب کیا ہوتا ہے۔ بہر حال جس طرح ابھینندن کے معاملے میں دونوں ممالک جنگ کے قریب پہنچ گئے تھے اسے دیکھتے ہوئے امریکہ اور دیگر دنیا کی پریشانی قابل فہم ہے۔ معمولی سی غلط فہمی بھی اگر ایٹمی جنگ میں بدل گئی تو اس کے مہلک اثرات صرف برصغیر تک محدود نہیں رہیں گے بلکہ یورپ اور دیگر دنیا کو بھی لپیٹ میں لیں گے۔ان سب کو اپنی فکر ہے۔

صدر پاکستانی میڈیا کے بھی قتیل نکلے۔ ایک رپورٹر کو دیکھتے ہی پوچھا کہ "کیا آپ کا تعلق پاکستان سے ہے؟"، اس نے اثبات میں جواب دیا تو فرمانے لگے "گڈ، میں پاکستانی رپورٹروں کا ایک جوڑا حاصل کرنا چاہتا ہوں، میں انہیں اپنے رپورٹروں سے زیادہ پسند کرتا ہوں"۔ گمان یہی ہے کہ وہ محترم صابر شاکر اور عارف بھٹی صاحب کا ذکر کر رہے ہوں گے کہ فی زمانہ ان سے بہتر رپورٹر کوئی دوسرا نہیں۔ بہر حال محترم ارشاد بھٹی وغیرہ بھی اچھے رپورٹر ہیں، شاید ان کا ذکر ہو۔ بہر حال وزیر اعظم کا یہ دورہ سفارتی محاذ پر ایک بڑی کامیابی ہے اور یہ بھی ظاہر کر رہا ہے کہ اس وقت امریکہ افغانستان سے جان چھڑانے کے لئے بڑی قیمت ادا کرنے کو بھی تیار ہے۔ جہاں تک پاکستان پر اس کے اثرات کا تعلق ہے، تو صدر ٹرمپ بتا چکے ہیں کہ پاکستان کا میڈیا اور اپوزیشن اسی اچھے حال میں رہیں گے جس میں ہیں، اور اس میں سے اچھے میڈیا کی امریکہ بھی قدر دانی کرے گا۔

جہاں تک اپوزیشن کی بات ہے تو اگر امریکہ سے کیے گئے قول قرار پورے کیے گئے اور ڈانلڈ ٹرمپ اگلی ٹرم کے لئے دوبارہ منتخب ہو گئے، تو پاکستان میں تحریک انصاف کی حکومت ہی رہے گی۔ ہاں اگر پاکستانی عوام وغیرہ نے مسلسل بگڑتی ہوئی معیشت سے گھبرا کر کوئی گڑبڑ کر دی تو دوسری بات ہے۔

قارئین کے لئے خوشخبری

خواتین وحضرات! خدا تعالیٰ کے فضل وکرم کے ساتھ عباسی اکیڈیمی لندن کے زیر انتظام ایک نیا رسالہ ''آ بگینے خواتین ڈائجسٹ'' جولائی 2019ء سے جاری کیا جارہا ہے۔

اس سے قبل اگست 2016ء میں ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اردو / انگریزی ہر دو زبانوں میں لندن سے جاری کیا گیا تھا۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ ماشاءاللہ ہزاروں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کے لئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ علاوہ ازیں دنیائے صحافت میں آپ کی قدر دانی سے اس رسالہ نے جو مقام حاصل کیا وہ قابل ستائش ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ رسالہ ''آ بگینے'' کو بھی وہی مقام نصیب ہو۔ آمین

صنف نازک کا یہ رسالہ تمام مکاتب فکر کے لئے، مذہب اور رنگ و نسل سے پاک ہے۔ اس کا اصل مقصد دنیا میں خواتین کا وہ مقام و مرتبہ جو اسلام نے دیا ہے اس کو ملے اور نئی نسل کو اچھے اخلاق میسر ہوں جس سے معاشرہ کو پُرامن بنایا جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو اس طور سے برکت دے کہ یہ رسالہ اس جرم سماوی (علم ودانش کی روشنی) کا سا رنگ اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ اس سے تمام دنیا میں آسمانی نور پہنچائے۔ آمین

یہ جولائی / اگست کا شمارہ ہے، اس کے بعد ستمبر سے ماہنامہ جاری ہوگا۔ اگلے ماہ سے اس کی نئی ویب سائٹ بھی تشکیل دی جائے گی جو کہ جدید تقاضوں کے عین مطابق ہوگی جس سے قارئین بھر پور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

محی الدین عباسی

سرپرست اعلیٰ وچیف ایڈیٹر

تاریخی درس گاہ ’’سندھ مدرستہ الاسلام‘‘

تحریر پروفیسر شاداب اختر صدیقی

تعلیم کا حصول کسی بھی قوم یا معاشرے کیلئے ترقی کا ضامن ہوتا ہے، یہی تعلیم قوموں کی ترقی اور عروج کا سبب بنتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان کبھی بھی جدید تعلیم سے ناآشنا نہیں رہے بلکہ دورِ جدید کے جتنے بھی علوم ہیں زیادہ تر کے بانی مسلمان ہی ہیں۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم و تربیت کی معراج پر پہنچ کر دین و دنیا میں عزت و توقیر حاصل کی۔

کسی بھی ملک کی ترقی کا دارومدار اس کے عوام کی شرحِ تعلیم پر ہوتا ہے۔ کسی بھی نئے تعلیمی ادارے کے قیام اور اس کی ترقی کے لئے کئے جانے والے اقدامات بلاشبہ نیک شگون ہوتے ہیں۔

’’سندھ مدرستہ الاسلام‘‘ کا قیام بھی علم دوستی اور ملک سے جہالت کے اندھیرے دور کرکے، اسے دنیا میں نمایاں مقام دلانا تھا۔ اس کا شمار کراچی کی قدیم درس گاہوں میں ہوتا ہے۔

یہ ادارہ مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کی غرض سے یکم ستمبر 1885ء میں قائم کیا گیا۔ اس وقت خطے کے مسلمان نہ صرف تعلیمی میدان میں بہت پیچھے تھے بلکہ وسائل اور ذرائع کی کمی کے ساتھ اس میں ان کی دلچسپی بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب بمبئی یونیورسٹی نے 1870ء میں پہلی مرتبہ میٹرک کے امتحان کا انعقاد کیا تو اس میں ایک بھی مسلمان طالبعلم کامیاب نہ ہوسکا۔ اگرچہ اس وقت سندھ میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 75 فیصد تھا۔ ایسے وقت میں مسلمانوں میں شعور اور آگاہی بیدار کرنے اور انہیں تعلیم کی جانب راغب کرنے کیلئے باقاعدہ تحریک چلانے کی اشد ضرورت تھی۔ سرسید احمد خان نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے علی گڑھ تحریک کا آغاز کیا اور 1875ء میں علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا۔ سرسید احمد خان کی تعلیمی خدمات سے متاثر ہوتے ہوئے اس دور کی ایک جید شخصیت اور ممتاز دانشور، حسن علی آفندی نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا اعادہ کیا۔ اس مشن میں انہیں کلکتہ کے تعلیمی ماہر سید امیر علی سمیت متعدد ہم خیال لوگوں کا تعاون بھی حاصل رہا۔ سید امیر علی نے نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے نام سے ایک سماجی و رفاہی تنظیم قائم کی تھی اور سندھ میں بھی اس کی شاخ کھولنے کا فیصلہ ہوا، جس کے صدر حسن علی آفندی نامزد کیے گئے۔ اس وقت سندھ میں ایک اچھے اسکول کے قیام کے لئے درکار وسائل کی شدید کمی تھی مگر جن کے ارادے پختہ ہوں، مشکلات اور مصائب ان کی راہ نہیں روک سکتے اور منزل ہر صورت ان کا مقدر بنتی ہے۔

تعلیمی ادارے کے قیام کے لئے فنڈز کی ضرورت تھی، انہوں نے چندہ لے کر وسائل کی اس کمی کو پورا کیا لیکن ادارے کے لیے جگہ کا مسئلہ برقرار رہا۔ اس وقت تک برصغیر میں ریلوے نظام متعارف نہیں ہوا تھا اور کراچی شہر میں افغانستان، ایران، عرب ممالک سمیت برصغیر کے دیگر حصوں تک تجارت اونٹوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ کراچی میونسپلٹی نے قافلوں کی سہولت کے لئے مسافر خانے تعمیر کئے تھے جنہیں ’’قافلہ سرائے‘‘ کہا جاتا تھا۔ انگریزوں نے جب ریل کی پٹڑیاں بچھائیں اور ٹرینوں کی آمدورفت شروع ہوئی تو مسافر خانوں کی ضرورت باقی نہ رہی۔ حسن علی آفندی کی سربراہی میں ایسوسی ایشن کے ایک وفد نے میونسپلٹی کو راضی کیا کہ یہ جگہ تعلیمی ادارے کے لئے وقف کر دی جائے۔ کچھ عرصہ انتظار کے بعد انہیں اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی اور یوں یکم ستمبر 1885ء کو سندھ مدرستہ الاسلام کا قیام عمل میں آگیا۔ جو آج بھی اسی جگہ پر قائم و دائم ہے۔ 2011ء میں اسے یونیورسٹی بنانے کا بل منظور ہوا اور 2012ء میں سندھ مدرستہ الاسلام یونیورسٹی کا چارٹر شیخ الجامعہ محمد علی شیخ کے حوالے کر دیا گیا۔

سندھ مدرستہ الاسلام کے بانی حسن علی آفندی سندھ کے ایک غریب گھرانے میں

14 اگست 1830ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق اخوند خاندان سے تھا اوران کے آباؤ اجداد ترکی سے ہجرت کر کے حیدرآباد میں آباد ہوئے تھے۔ انہوں نے وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ حسن علی آفندی کے فلاحی کارناموں کے اعتراف میں برطانوی سرکار نے انہیں ''خان بہادر'' کا خطاب دیا۔ آپ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ اور 1934ء سے 1938 تک سندھ کی قانون ساز اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ ان کا انتقال 20 اگست 1895ء میں ہوا۔

سندھ مدرسۃ الاسلام کے قیام کے وقت 1885 میں اس کے پہلے مینجمنٹ بورڈ کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے سب سے بڑے بیٹے مسٹر علی محمد نے اپنے والد حسن علی آفندی کی جگہ سنبھالی۔ انہوں نے اس وقت محسوس کیا کہ مدرسہ کے انتظامات درست نہیں چل رہے لہٰذا انہوں نے ادارے میں تبدیلی لانے کا فیصلہ کیا۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے اس وقت برٹش حکومت سندھ میں سرگرم عمل تھی۔ ان کی کوششوں سے از سر نو سندھ مدرسۃ الاسلام کا مینجمنٹ بورڈ تشکیل دیا گیا۔ 30 نومبر 1896 کو مسٹر ایچ ای یو جیمز کمشنر سندھ کو صدر جب کہ آر جائلز، کلکٹر کراچی کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ Mr.HS . Lawrence خان بہادر شیخ صادق علی، شیر علی، سیٹھ غلام حسین چھاگلہ، خان بہادر خداداد خان، سیٹھ معیز الدین جے عبدالعلی، مسٹر محمد حسین، میاں خیر محمد ابدالی اور ڈاکٹر جے ایف مرزا، مرزا لطف علی بیگ، پرنسپل مسٹر ولی محمد بطور سیکرٹری بورڈ میٹنگ میں شامل تھے۔ مگر کچھ عرصے بعد ہی ولی محمد اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے۔ پرنسپل کی رخصتی کے بعد، وائس پرنسپل مسٹر ڈی پی کوٹلہ کو پرنسپل کا چارج دیا گیا جو کہ ایک سال اپنے عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران خیر پور ریاست نے پیشکش کی کہ اگر یورپین پرنسپل سندھ مدرسۃ الاسلام میں مقرر کیا گیا تو ریاست سالانہ 12 ہزار روپے ماہوار گرانٹ دے گی۔ لہٰذا پیشکش کو قبول کرتے ہوئے یورپین پرنسپل کی تلاش شروع کر دی گئی اور مسٹر پیری ہائیڈ کو پرنسپل نامزد کر دیا گیا۔ انہوں نے چھ سال 1897۔1903ء تک اپنی خدمات انجام دیں۔ سندھ مدرسۃ الاسلام کے دیگر پرنسپلز میں اے ایم میتھیو اینگلو انڈین اسکالر لاہور، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ، 1930ء تک پرنسپل رہے۔ ان کے بعد مسٹر ہیمیسن پرنسپل مقرر ہوئے۔

سندھ مدرسے کی 134 سال پر محیط تاریخ میں یہاں سے کئی تاریخی شخصیات فارغ التحصیل ہونے کے بعد مسلم امہ کے لیے فقید المثال کارہائے نمایاں انجام دیتی رہیں۔ 1887ء میں سندھ مدرسۃ الاسلام کے قیام کے دو سال بعد قائداعظم محمد علی جناح نے اس مادرِ علمی میں داخلہ لیا۔ آپ 1887ء سے 1897ء تقریباً ساڑھے چار سال اس ادارے سے وابستہ رہے۔ قائداعظم کو اپنی مادرِ علمی سے اس قدر محبت تھی کہ انہوں نے اپنی وصیت میں اپنی جائیداد کا ایک تہائی حصہ اس ادارے کے نام کر دیا تھا۔ ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے 21 جون 1943ء کو سندھ مدرسۃ الاسلام کالج کا قیام عمل میں آیا، جس کا افتتاح قائداعظم نے اپنے دست مبارک سے کیا۔ اس تاریخی موقع پر انہوں نے اس ادارے سے اپنی وابستگی کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ ''میں اس ادارے کے میدانوں کی ایک ایک انچ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جہاں میں نے مختلف کھیلوں میں حصہ لیا اور پڑھا ہوں۔ آج مجھے خوشی ہے کہ میں اسے کالج کا درجہ دے رہا ہوں۔''

سندھ مدرسے نامور طلباء میں سر عبداللہ ہارون، سر شاہنواز بھٹو، سر غلام حسین ہدایت اللہ خان، خان بہادر محمد ایوب کھوڑو، شیخ عبدالمجید سندھی، علامہ آئی آئی قاضی، محمد ہاشم گزدر، غضنفر علی خان، چودھری خلیق الزماں، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ، محمد ابراہیم جویو، جسٹس سجاد علی شاہ، قاضی محمد عیسیٰ، رسول بخش پلیجو، اے کے بروہی، علی احمد بروہی، پیر الٰہی بخش، میر غوث بخش بزنجو، عطاءاللہ مینگل، غلام محمد بھرگڑی، علامہ علی خان ابڑو، جی الانہ، حکیم محمد احسن، موسیقار سہیل رعنا، فلمسٹار ندیم، قومی ترانے کی دھن کے خالق احمد علی چھاگلہ، میران محمد شاہ، قاضی فضل اللہ، لٹل ماسٹر حنیف محمد اور بے شمار اہل علم شعراء، ادباء، وکلاء، سیاست دانوں نے یہاں سے استفادہ کیا۔

اس تاریخ ساز ادارے کی مرکزی عمارت کا سنگ بنیاد گورنر جنرل و وائسرائے آف انڈیا لارڈ ڈفرن نے 14 نومبر 1887ء میں رکھا تھا۔ یہ عمارت گوتھک طرز تعمیر کا خوبصورت شاہکار ہے جس کا ڈیزائن کراچی میونسپلٹی کے انجینئر جیمس اسٹریجن نے بنایا تھا۔ سندھ مدرسے کی دوسری قدیم عمارت حسن علی آفندی لائبریری ہے۔ یہ عمارت 19 ویں صدی کے آخری دنوں میں خیر پور ریاست کے ٹالپر حکمرانوں کی مالی معاونت سے پرنسپل ہاؤس کے طور پر تیار کی گئی تھی۔ 1985ء میں اس عمارت کو لائبریری میں تبدیل کیا گیا تھا۔ آج اس لائبریری میں 20 ہزار سے زائد کتابیں موجود ہیں جن میں ایک صدی قدیم کتابیں بھی شامل ہیں۔ سندھ مدرسے کی ایک اور خوبصورت عمارت ٹالپور ہاؤس ہے جو جدید اور اسلامی طرز تعمیر کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ یہ عمارت بھی سندھ کے سابق ٹالپر حکمرانوں کی مالی اعانت سے جولائی 1901ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ ابتداء میں ٹالپر ہاؤس سندھ مدرسے میں ٹالپر حکمرانوں کے زیر تعلیم بچوں کے لئے بورڈنگ ہاؤس کے طور پر زیر استعمال تھا۔ قائداعظم اور دیگر شخصیات جو سندھ مدرسے سے وابستہ رہیں ان

کے استعمال کی اشیاء اور نوادرات کیلئے جناح میوزیم بھی ہے۔

سندھ مدرستہ الاسلام شہر کراچی کے مصروف ترین کاروباری مرکز میں واقع ہے اور آئی آئی چندریگر روڈ کے پاس حبیب بینک پلازہ سے متصل ہے۔ ساتھ ہی چیمبر آف کامرس کراچی کی عمارت ہے۔ جب کہ گردونواح میں سٹی ریلوے اسٹیشن، اسٹیٹ بینک آف پاکستان، نیشنل بینک آف پاکستان، میڈیا کے دفاتر، پاکستان اسٹاک ایکسچینج، ٹاور اور ساتھ ہی برنس گارڈن واقع ہیں۔

آج اس مادرِ علمی میں جدید تقاضوں کے مطابق علمی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں۔ اس میں چار سائنسی لیبارٹری قائم ہیں۔ فزکس، کیمسٹری، بوٹنی اور زولوجی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تین کمپیوٹر سینٹرز قائم ہیں۔ کمپیوٹر سینٹرز سندھ مدرسے کے سابق طلباء کے ناموں سے منسوب ہیں۔ قائداعظم کمپیوٹر سینٹر، سر عبداللہ ہارون کمپیوٹر سینٹرز اسی عمارت میں واقع ہیں جبکہ ڈاکٹر محمد داؤد پوتہ کمپیوٹر سینٹر گرلز سیکشن میں واقع ہے۔

سندھ مدرسہ الاسلام اپنے قیام کے 58 برس بعد کالج کے مدارج تک پہنچا اور پھر مزید آگے کے مراحل طے کرتے ہوئے 79 سال بعد بالآخر جامعہ کا روپ دھار گیا۔ 1974ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں دیگر تعلیمی اداروں کی طرح اسے بھی قومیا لیا گیا ہے۔ جس کے بعد سے یہ صوبائی حکومت کے زیر انتظام ہے۔ سندھ مدرستہ الاسلام کو جامعہ کا درجہ دلانے کے لئے سابق صدر مملکت آصف علی زرداری (جو کہ حسن علی آفندی کے پڑنواسے بھی ہیں) نے خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ سندھ مدرستہ الاسلام یونیورسٹی کے قیام کا بل دسمبر 2011ء میں سندھ اسمبلی سے منظور ہوا اور 21 فروری 2012ء کو گورنر سندھ جناب عشرت العباد خان نے مدرستہ الاسلام یونیورسٹی کا چارٹر شیخ الجامعہ محمد علی شیخ کے حوالے کیا۔ جس کے بعد 2012 میں اس میں پہلے تعلیمی سیشن کا آغاز ہوا۔ ابتدائی طور پر یہاں پانچ شعبہ جات میں تعلیم دی جا رہی ہے، جن میں کمپیوٹر سائنس، بزنس ایڈمنسٹریشن، میڈیا اسٹڈیز، ایجوکیشن اور انوائرنمنٹل اسٹڈیز شامل ہیں۔ جب کہ کچھ ہی سالوں میں دیگر اہم شعبوں کا آغاز بھی کیا گیا۔ جامعہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل پی ایچ ڈی فیکلٹی کو سوفی صد میرٹ کی بنیاد پر رکھا گیا ہے۔ سندھ مدرسے یونیورسٹی میں ٹی وی اسٹوڈیو، ایف ایم ریڈیو اسٹوڈیو بھی شامل ہیں۔

اسے جامعہ کا درجہ حاصل ہونے کے بعد شہر قائد میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کی کمی کا ازالہ ممکن ہوا ہے، جو کہ بلاشبہ اعلیٰ درس وتدریس کے شعبے میں مثبت قدم ہے۔

سندھ مدرستہ الاسلام دنیا کی ان چند درس گاہوں میں سے ایک ہے جن کی تاریخی حیثیت اور اہمیت کو عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ سندھ مدرسے کی اس طرح کی عالمی حیثیت کی وجہ اس ادارے کے سابق طلباء قائداعظم محمد علی جناح، سر شاہنواز بھٹو، عبداللہ ہارون اور سر غلام حسین ہدایت اللہ ہیں۔ حسن علی آفندی کی علمی خدمات کو ہمیشہ سنہری الفاظ میں یاد رکھا جائے گا۔ سندھ مدرستہ الاسلام یونیورسٹی ترقی اور کامیابی کی طرف گامزن ہے۔ سندھ مدرستہ الاسلام کو ''لیڈرز آف نرسری'' بھی کہا جاتا ہے۔ سندھ مدرستہ الاسلام یونیورسٹی کے پہلے کیمپس ملیر کیمپس کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے لئے 100 ایکڑ زمین سندھ کی صوبائی حکومت نے بلامعاوضہ فراہم کی ہے ملکی ترقی کے لئے معاشی استحکام ناگزیر ہے اسی طرح معاشی ترقی میں تیزی اعلیٰ تعلیم کے فروغ سے ہی ممکن ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور تحقیق سے دورِ جدید اور عصر حاضر کی ضروریات کے مطابق ترقی یقینی ہے۔ پاکستان کے ہر شہر میں تعلیمی اداروں کا قیام وقت کی اہم ضرورت ہے۔ حسن علی آفندی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمارے سیاستدانوں کو قوم اور ملک کی بقاء اور ترقی کے لئے تعلیمی کی وسعت اور ترقی کے لئے اہم اقدامات کرنے ہوں گے۔ جو تاریخی درس گاہیں خاص طور پر سندھ مدرستہ الاسلام موجود ہیں ان کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے اور ان کی تزئین وآرائش پر خصوصی توجہ دی جائے۔ یہ تاریخی درس گاہیں ہمارا قومی اثاثہ ہیں اور مستقبل کے معماروں کی تعلیم وتربیت میں اپنا اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ سندھ مدرستہ الاسلام ہماری پہچان ہے اور ہمارا قومی وقار ہے۔ بانی پاکستان قائداعظم کو اپنی مادرِ علمی سے بے حد محبت تھی۔ ہمیں قائد کی نشانی کو رہتی دنیا تک محفوظ رکھنا ہے۔

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

جنرل جان جیکب کا جیکب آباد بدل چکا

تحریر ریاض سہیل

دو پہر ایک بجے کا وقت ہے اور درجہ حرارت 45 سینٹی گریڈ پر پہنچ چکا ہے۔ ایک بوڑھا شخص لاٹھی کا سہارا لیے لوہے کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہوتا ہے۔

وہ کندھے پر موجودہ کپڑے سے سفید سنگِ مرمر سے بنی قبر سے دھول مٹی ہٹانا شروع کر دیتا ہے اور اس اثنا میں اس کی نظر اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈتی رہتی ہے۔

اس کی نظر ایک کونے میں پڑے چراغ پر جا کر ٹھہر جاتی ہے لیکن چراغ میں تیل موجود نہیں۔ وہ اس قبر پر ویسے ہی ہاتھ پھیر رہا ہے جیسے مزاروں پر عقیدت مند پھیرتے ہیں۔

یہ کس کی قبر ہے؟ اس سوال پر اس کا کہنا تھا کہ یہ ’جیکب صاحب کی قبر ہے۔ یہ بزرگ تھے۔ اچھے انسان کو ہر کوئی سلام کرتا ہے۔ یہ کوئی دشمن تو نہیں تھا یہ اچھا انسان تھا اس کو ہر کسی کا فکر ہوتا تھا جیکب آباد اس کے نام پر قائم ہے۔‘

اس بوڑھے شخص کا نام الٰہی بخش ہے جو ہفتے میں ایک مرتبہ یہاں آ کر ’جیکب صاحب‘ کی قبر پر دیا روشن کرتے ہیں۔

برطانوی دور حکومت میں جان جیکب بالائی سندھ کے پہلے پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ تھے۔

اُن دنوں میں برطانوی فوج کی جانب سے خصوصی فرنٹیئر ریگیولیشن کے ذریعے اس علاقے کا انتظام و انصرام چلایا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ 1848 تک جاری رہا جب تک کہ سویلین ڈپٹی کمشنر تعینات نہیں کیے گئے۔

برطانوی حکومت نے جنگجو قبائل پر ضابطہ نافذ کرنے کے لیے انھیں یہاں تعینات کیا تھا۔ اس سے قبل وہ چارلس نیپیئر کی قیادت میں حیدرآباد میں تالپور حکمرانوں کے ساتھ جنگ میں شریک تھے، جس کے بعد انگریز سرکار نے پورے سندھ کا کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔

جان جیکب کی قبر

جان جیکب کا انتقال 1858 میں 46 برس کی عمر میں ہوا تھا اور ان کی تدفین وصیت کے مطابق اسی علاقے میں کی گئی۔

ان کی قبر پر روایتی صلیب کا نشان موجود نہیں۔ جس قبرستان میں جان جیکب دفن ہیں وہاں ان کے انتقال سے قبل اور بعد کے برطانوی فوجیوں کی قبریں بھی موجود ہیں جن پر صلیب اور مجسمے موجود تھے لیکن موسمی اثرات نے جہاں انھیں شکست و ریخت کا شکار کیا وہاں انسانی نقل و حرکت سے یہ بھی متاثر ہوئیں۔

بریز نیوٹن 1985 سے جان جیکب قبرستان کا انتظام سنبھال رہے ہیں۔ ان کا

کہنا ہے کہ برٹش ایسوسی ایشن فار سیمیٹریز ان ساؤتھ ایشیا اور کامن ویلتھ وار سیمیٹری کے تعاون سے اس قبرستان کی چار دیواری تعمیر کی گئی اور گیٹ لگایا گیا لیکن ایک ٹرک کی ٹکر سے دیوار گر گئی۔

بریز کے مطابق دیوار نہ ہونے کی وجہ سے جانور احاطے میں داخل ہو جاتے ہیں اور قبروں کو نقصان پہنچاتے ہیں جبکہ کچھ لوگ مذہبی جنونی بھی ہیں جو توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔

ان کا مزید کہنا تھا کہ ڈپٹی کمشنر اور علاقے سے منتخب ہونے والے رکن قومی اسمبلی کو بھی درخواست دی ہے لیکن ان کے مطابق حکومت کی آثارِ قدیمہ میں دلچسپی کم ہے۔

خان گڑھ سے جیکب آباد

جان جیکب نے جنگجو قبائل کو کنٹرول میں کرنے کے بعد خان گڑھ میں جدید خطوط پر ایک شہر کی منصوبہ بندی کی جس میں چھاؤنی کے علاوہ عام شہریوں کی کالونی، سڑکیں، فراہمی اور نکاسی آب کا نظام اور بازار شامل تھے۔ ان میں سے کچھ کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔

ترقیاتی پروگرام کے لیے فنڈز دستیاب نہیں تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے ایک بیابان کو سرسبز علاقے میں تبدیل کیا اور یہاں دریائے سندھ سے بیگاری کینال کے ذریعے پانی لایا گیا۔

اس شہر کی تعمیر کے لیے زمینداروں نے افرادی قوت فراہم کی، اسی لیے اس کا نام بیگاری کینال رکھا گیا۔ انھوں نے تعیناتی سے انتقال تک 30 برس کا عرصہ یہاں گزارا اور دس لاکھ درخت لگائے۔

کبوتر خانہ

جان جیکب نے جہاں عسکری اور انتظامی امور سرانجام دیے وہیں انھوں نے غیر روایتی انداز بھی اختیار کیا۔

ان دنوں میں پیغام رسانی کا موثر نظام نہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے اس کام کے لیے کبوتروں کا استعمال کیا۔ اور اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنی رہائش گاہ میں کبوتروں کی ایک نرسری قائم کی۔

برطانوی دور حکومت کے ڈپٹی کمشنر روجر پیرس نے اپنی آپ بیتی 'ونس اے ٹسپی ویلی' میں تحریر کیا ہے کہ پہاڑی علاقوں کے بلوچ قبائلی سندھ کے میدانی علاقوں میں حملہ آور ہوتے تھے جان جیکب نے پہلے انھیں لڑائی میں شکست دی۔

اس کے بعد ان کوششوں کی روک تھام کے لیے مستقل گشت کا سلسلہ شروع کیا گیا جس کے لیے جان جیکب شہر جیکب آباد اور چیک پوسٹوں کے درمیان پیغام رسانی کا کام کبوتروں سے لیتے تھے۔

30 فٹ اونچے اس کبوتر خانے میں آج بھی بڑی تعداد میں کبوتر آباد ہیں۔ مقامی صحافی جان اوڈھانو کے مطابق یہ کبوتر خانہ زبوں حالی کا شکار ہو گیا تھا لیکن چند سال قبل ایک ڈپٹی کمشنر نے اس کی مرمت کرائی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سوشل میڈیا کے ایپ سنیپ چیٹ میں اس شہر کی شناخت اس کبوتر خانے سے ہے۔

جیکب صاحب کی میڈم

جان جیکب شادی شدہ نہیں تھے اور برطانوی ماہر آثار قدیمہ اور تاریخ نویس ایچ ٹی لیمبرک نے اپنی کتاب جان جیکب آف جیکب آباد میں تحریر کیا ہے کہ جیکب نہیں چاہتے تھے کہ ان کے افسران شادی کریں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ انڈیا میں زندگی بہت سخت اور تلخ ہے۔

'ان سے جب بلوچ سردار سوال کرتے کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتے تو ان کا اکثر جواب ہوتا کہ اگر مر جاؤں تو میری بیوی کسی دوسرے سے شادی کر لے گی۔ کیا میں اس کو نظر انداز کر سکتا ہوں کہ جیکب صاحب کی میڈم نے دوسرا شوہر کر لیا۔'

جان جیکب کے انتقال سے تقریباً ایک سال قبل یعنی 1857 میں جب جنگ آزادی شروع ہوئی اور مقامی فوجیوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی۔

اس وقت وہ جیکب آباد میں بریگیڈیئر کے منصب پر پہنچ چکے تھے، ان کے گھڑ سوار جتھے میں کوئی بغاوت نہیں ہوئی اور اس کی وجہ ان کی فوج میں مقامی افراد کی اکثریت کو قرار دیا جاتا ہے۔

جیکب کلاک

جان جیکب کو عسکری اور منتظم کے علاوہ انجینئرنگ اور میکینکل ذہانت بھی حاصل تھی۔ انھوں نے ایک گھڑیال بنایا جو اپنی نوعیت کا ایک منفرد نمونہ ہے۔

یہ لکڑی کے ایک باکس میں ڈپٹی کمشنر کی رہائش گاہ میں نصب ہے جو کبھی جان جیکب کی رہائش گاہ ہوا کرتی تھی۔

اس کی نگرانی جہانگیر خان نامی نوجوان کرتا ہے۔ اس گھڑیال میں اسلامی تاریخ، چاند کا سائز، برطانوی اور مقامی وقت بھی موجود ہیں۔ اس گھڑیال کو جان جیکب نے خود ڈیزائن کیا تھا۔

جہانگیر کے مطابق یہ گھڑیال سپرنگ ٹیکنالوجی اور زمین کی کشش ثقل کے تحت کام کرتا ہے اس میں ایک ہزار کلو وزنی پنڈولم لگایا گیا ہے۔

پینڈولم کو زمین اپنی طرف کھینچتی ہے جس سے گھڑیال کے کانٹوں میں حرکت آتی ہے، یہ پینڈولم 32 میٹر زیر زمین جاتا ہے اور پھر چابی گھما کر اسے اوپر لایا جاتا ہے اور یہ مشق ہر 15 روز بعد کی جاتی ہے۔

جہانگیر کے مطابق پہلے ان کے نانا، اس کے بعد بھائی اور اب وہ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں لیکن اس کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ بعض اوقات جب اس کا کوئی پرزہ ٹوٹ جاتا ہے تو اس کی مرمت بھی اپنی جیب سے کروانی پڑتی ہے۔

2007 میں پاکستان کی سابق وزیر اعظم بینظیر بھٹو کی ہلاکت کے بعد ہونے والی ہنگامہ آرائی میں اس گھڑیال کو بھی نقصان پہنچا تھا لیکن بعد میں اس کی مرمت کر کے اسے بحال کیا گیا تاہم اس تک عام لوگوں کی رسائی نہیں۔

جان جیکب کا جیکب آباد بدل گیا۔

برطانوی راج کی جنوبی ایشیا سے روانگی کے بعد بھی جیکب آباد کی خطے میں عسکری اہمیت برقرار رہی۔

امریکہ نے جب افغانستان میں طالبان حکومت کے خلاف آپریشن شروع کیا تو جیکب آباد کے شہباز ایئربیس کا نظام ان کے حوالے کیا گیا۔

یہ شہر سندھ اور بلوچستان کو معشیت کے علاوہ روایتی، سماجی اور ثقافتی طور پر بھی جوڑتا ہے۔ یہاں خان آف قلات سے لے کر نواب اکبر بگٹی تک کی رہائش گاہیں موجود تھیں جو سب اب ماضی کا حصہ بن گئی ہیں۔

جہاں اس شہر کی قدیم تعمیرات اور جان جیکب سے وابستہ یادیں مسمار اور ناپید ہو رہی ہیں وہاں اس شہر کا مزاج بھی تبدیل ہو رہا ہے۔

یہاں فرقہ وارانہ کشیدگی کے نتیجے میں 2015 میں ماتمی جلوس پر خودکش حملہ کیا گیا۔ کچھ لوگوں نے شہر کا نام جیکب آباد سے تبدیل کر کے عطار آباد رکھنے کی بھی کوشش کی اور وجہ یہ ہی بتائی کہ جان جیکب ایک فرنگی اور مسیحی تھا۔

(بشکریہ بی بی سی)

”حسن یوسف اور مولوی غلام رسول عالمپوری“

لاہور نیوز ڈیسک

جب کبھی کوئی کھوئی ہوئی یاد دل کے نہاں خانوں میں سراب کی صورت‘ ایک دھندلے خواب کی صورت یوں جھلملانے لگتی ہے کہ کبھی وہ صاف ظاہر ہوتی ہے اور کبھی بیتے زمانوں کے اندھیاروں میں گم ہو جاتی ہے تو تین چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اس یاد کو سراب سے دریافت کر کے آپ کی یادداشت کے جھروکوں میں پہچان کے چراغ جلا دیتی ہیں ایک تو شکل‘ کوئی منظر‘ کوئی لینڈ سکیپ‘ دوسری چیز ہے خوشبو اور تیسری چیز ہے کوئی آواز کوئی گیت کوئی لے۔ تو ہم ابھی لینڈ سکیپ یا خوشبو سے صرف نظر کرتے ہیں کہ یہ موضوع طوالت کا متقاضی ہے اور صرف آواز اور لے پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ میرے بچپن کی یادوں میں ایک ملنگ فقیر ہے جو کبھی میرے گاؤں اور کبھی شہر لاہور کی گلیوں میں گاتا پھرتا ہے۔ اس کے سبز چولے کا رنگ عجب ہے اور اس کی دائیں کلائی میں پانچ چھ لوہے کے کڑے آویزاں ہیں اور وہ دائیں ہاتھ میں ہی ایک لکڑی کا تیل میں بھیگا ہوا دو بالشت کا گول ڈنڈا تھامے ہوئے ہے۔ وہ اس ڈنڈے سے بازوؤں میں جھولتے آہنی کڑوں پر ایک خاص ردھم میں ضرب لگا کر ان میں سے ایک مجذوب سی لے تخلیق کرتا ہے اور وہ بلند اور درد بھری آواز میں گلیوں میں گاتا پھرتا ہے کہ ”جس ویلے یعقوب نبی تھیں یوسف ہویا راہی“ یہ قصہ یوسف زلیخا کے ساتھ میرا پہلا تعارف تھا جو آج بھی میرے ذہن کے اندر اپنی مخصوص لے کے ساتھ محفوظ ہے اور مجھے ستر برس پیشتر کے زمانوں میں لے جاتا ہے۔ لوگ اکثر اسے دارے میں لے جاتے ہیں اور وہ بلا تکان قصہ یوسف زلیخا گاتا رہتا ہے اور جب کبھی وہ یہ مصرعہ دوہراتا ہے کہ۔ جب یعقوب نبی سے یوسف جدا ہو کر راہی ہوا۔ تو سننے والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور اسی مصرعے کے راستے میں بالآخر ادھیڑ عمر میں مولوی غلام رسول عالم پوری کے شاہکار ”احسن القصص“ یعنی ”قصہ یوسف زلیخا“ تک پہنچا۔ یہ ہم پنجابیوں کی بدقسمتی ہے جس کے ہم خود ہی ذمہ دار ہیں کہ ہم پنجابی ”دیکھ“ نہیں سکتے اور ہمیں پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ ہم نے انگریزی‘ اردو‘ فارسی اور عربی کو اپنایا اور پنجابی پرائی کر دی۔ دراصل کوئی بھی زبان جس پر آپ کا کسی حد تک عبور ہو ”پڑھی“ نہیں جاتی۔ ”دیکھی“ جاتی ہے۔ اس کا ہر لفظ آپ کی یادداشت پر ثبت ہوتا ہے اور آپ اس لفظ کے ہجے نہیں کرتے اسے صرف دیکھ کر جان جاتے ہیں کہ یہ کیا ہے۔ آپ کی آنکھیں اس لفظ کی شکل اور ہیئت سے آشنا ہوتی ہیں اس لئے آپ اسے دیکھ کر جان جاتے ہیں کہ یہ کیا ہے یعنی اسے ”پڑھتے“ نہیں صرف دیکھتے ہیں اور شناسائی کا در کھل جاتا ہے۔ چنانچہ ہم پنجابی دیکھتے نہیں پڑھتے ہیں اور مصیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بے حد دشواری ہوتی ہے اور پھر ہم اس زبان کی لامتناہی وسعتوں سے بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ اکثر لفظ ہمارے سر سے گزر جاتے ہیں۔ بہر طور یہ سب خامیاں میرے اندر بھی موجود تھیں لیکن میں نے اپنے تئیں کوشش کی۔ اپنے آپ کو وقف کیا اور تب جا کر کسی حد تک پنجابی نثر اور شاعری کی عظمت کی قربت میں پہنچا۔ جہاں تک ممکن تھا میں نے بلھے شاہ‘ شاہ حسین‘ دمودر‘ وارث شاہ‘ سلطان باہو‘ میاں محمد بخش کی عظیم شاعری کے جہانوں میں رسائی حاصل کرنے کی اکثر ناکام سعی کی لیکن جب میں ”احسن القصص“ کے سمندر میں اترا تو مولوی غلام رسول نے تو اپنی قادر الکلامی سے مجھے ڈبو دیا‘ خوب غوطے دیے۔ ان کی بے مثل لفاظی سے جانبر ہونا مشکل تھا لیکن میں بھی غوطے کھانے کے بعد سانس درست کرتا اور پھر سے مولوی غلام رسول کے بحر بے کراں میں اتر جاتا۔ اگرچہ میرے لئے یہ ایک مشقت تھی لیکن اس مشقت میں تخلیقی معجزوں اور زبان کی سحر طرازیوں کے جو لطف اٹھائے ہیں۔ جی جانتا ہے۔ پنجابی کے صوفی اور رومانی شعرا کا آپس میں موازنہ کرنا کہ ان میں سے کون افضل ہے صرف کوتاہ بینوں کا کام ہے کہ ان سب کے اپنے اپنے عرش ہیں۔ اپنے اپنے راج سنگھاسن ہیں لیکن مولوی غلام رسول کے ساتھ ہم نے بہت غفلت برتی اور انہیں بہت کم ان بڑے شاعروں کی

صف میں شامل کیا گیا۔ جب کہ ان کے کلام کی تاثیر اور لفظوں پر حکومت کی مثال کم کم ملتی ہے۔ جس شخص نے صرف پندرہ برس کی عمر میں ''داستان امیر حمزہ'' شروع کی جو بالآخر بیس ہزار اشعار میں مکمل ہوئی ''روح الترتیل'' انیس برس کی عمر میں تصنیف کی اور ''احسن القصص'' جیسا شاہکار چوبیس برس کی عمر میں مکمل کیا اس کے نابغہ روزگار ہونے میں کسی شک کی گنجائش ہے؟۔ مولوی صاحب 1849ء میں عالم پور ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے اور صرف تینتالیس برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ اس مختصر حیات میں انہوں نے ''احسن القصص'' کے علاوہ سی حرفی سسی پنوں' سی حرفی چوپٹ نامہ' پند نامہ کے علاوہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے حلیہ شریف کے بارے میں جو بیان تحریر کیا ہے' اس کی ہر سطر نے مجھ پر وجد طاری کر دیا۔ 'جسم شریف لطیف انور خوشبو ناک کستوریوں بھاوندا اے/ اک وار جس راہ تھیں گزر جاندے کئی مدتاں اثر نہ جاوندا اے/ یاراں دے وچ ممتاز سوہنا ایسا ہور سوہنا کون آیا ای/ جانی سوہنے دا سب کُجھ اَنت سوہنا اول آخروں ایہہ فرمایا ای/ علاوہ ازیں انہوں نے اپنے دوستوں کے نام جو منظوم چٹھیاں لکھی ہیں ان کی اثر انگیزی تو رُلا دیتی ہے۔ 'رو رو لکھئے چٹھیئے درد بھریئے پتہ نہیں پردیس دے واسیاں دا پھیرا گھت پُرانیاں سجناں تے چل پچھ لے حال اداسیاں دا'' قصہ یوسف زلیخا'' پڑھتے ہوئے جب پہلی بار حضرت یوسف سامنے آتے ہیں تو مولوی صاحب نے ان کے حُسن کے بیان میں صفحے کے صفحے لکھ ڈالے۔ تشبیہات اور موازنے ایسے استعمال میں لائے کہ انسان سحر زدہ ہو جائے۔ حضرت یوسف جب بھی اس قصے میں ظاہر ہوئے مولوی صاحب نے ان کے حُسن کی مثالوں سے حیران کر دیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب پانچویں یا چھٹی مرتبہ حضرت یوسف نمودار ہوئے تو میں نے کتاب بند کر دی اور اپنے آپ سے نہیں مولوی صاحب سے دل ہی دل میں مخاطب ہو کر کہا'' مولوی صاحب' اب کیا کرو گے۔ حرف سب تمام ہوئے۔ لفاظی بنتی تھی وہ آپ نے صرف کر دی تو اب یوسف کے حسن کے بیان کے لئے کیا کرشمہ کرو گے؟۔ اور خواتین وحضرات یقین کیجیے مولوی صاحب نے پھر کئی صفحے لکھ ڈالے۔ کیسے؟ انہوں نے نئی تراکیب تراشیں۔ نئے لفظ ایجاد کئے۔ پرانے حرفوں کو نیا روپ دیا یعنی زبان ہی نئی تخلیق کر ڈالی۔ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ ایک بڑا لکھنے والا ایک نئی گرائمر بناتا ہے۔ نئی لفاظی تراشتا ہے۔ بامحاورہ اور گرائمر کی پیروی کرتے ہوئے سو فیصد درست نصابی زبان لکھنے والے صرف منشی لوگ ہوتے ہیں۔ بڑا ادیب اپنی زبان لے کر خود آتا ہے اور اسے نئے پیکروں میں ڈھالتا ہے۔ مولوی غلام رسول عالم پوری ان معاملات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ میں اگر مولوی غلام رسول عالپوری کانفرنس پر دیگر زعما کے ہمراہ سٹیج پر بیٹھا تھا تو اس لئے کہ میں مولوی صاحب کو اپنا مرشد مانتا تھا اور میں ہر اس شخص کو اپنا مرشد قرار دیتا ہوں جس کی لکھتوں سے میں نے لکھنا سیکھا۔ وہ بلھے شاہ' سچل سرمست یا شاہ حسین ہوں' ٹالسٹائی' ہرسے سراما گو۔ والٹ وہٹ مین یا ٹی ایس ایلیٹ ہو یا پھر امراؤ جان ادا ہو۔ علاوہ ازیں مولوی صاحب کے خانوادے کے صاحبزادہ سعود احمد نے بھی شدید خواہش کی کہ صدارت کا بوجھ مجھ ناتواں پر ہی ڈالا جائے۔ میرا دل خوشی سے بھر گیا جب میں نے دیکھا کہ بھرے ہوئے ہال میں اکثریت نوجوان لڑکیوں کی تھی جو پنجابی کے اس بڑے شاعر کی مداح تھیں۔ گویا وہ اپنی اصل ثقافت اور زبان کی جانب لوٹ رہی تھیں۔ یہ کانفرنس صغرا صدف کے ادارے پلاک نے لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی کے تعاون سے منعقد کی۔ اس یونیورسٹی کی متانت بھری ڈاکٹر مجاہدہ بٹ کے مقالے نے مجھ پر کئی در روشن کر دیے۔ صاحبزادہ سعود عالم پوری ایک شخص نہیں ایک ادارہ ہیں۔ جنہوں نے مولوی صاحب کی عظمت کے کئی چراغ ان کی کتابوں کی صورت میں روشن کئے ہیں۔ وہ باقاعدگی سے ہندوستان جا کر مولوی صاحب کے مرقد پر حاضری دیتے ہیں۔ ان کی لگن قابل تقلید تھی۔ میں ایک مدت بعد پلاک کی عمارت میں داخل ہوا تھا۔ تب صغرا صدف اور سٹیج پر بچھا قالین نئے نکور تھے۔ صغرا کو تو نہیں البتہ قالین کو اگر بدل دیا جائے تو کچھ حرج نہیں۔ یہ قالین مغل نوادر کے طور پر آسانی سے بازار میں فروخت ہو جائے گا۔

پاکستان میں احمدیوں کی زندگی: ’ہمارے گھر میں خوف کی فضا تھی‘

تحریر رضا ہمدانی

احمدیوں کے لیے پاکستان میں جگہ تنگ ہوتی جائے گی اگر ریاست کا ایک ستون انتظامیہ ان کے ان حقوق کے لیے کھڑا نہیں ہوتا جو اس ملک کے آئین میں درج ہیں۔ اور دوسرا ستون مقننہ مذہبی جماعتوں کے دباؤ میں گھٹنے ٹیک دے تو وہ بھی اسی مہم کا حصہ بن جاتا ہے۔

رضا ہمدانی کنسلٹنٹ ایڈیٹر، دی انڈپینڈنٹ

اسلام آباد کے ایک کیفے کے باہر تقریباً شام کے چھ بجے تھے اور میں شفیق احمد کے انتظار میں تھا۔ 30 سالہ شفیق احمد احمدی ہیں اور میں ان سے ان کے مسائل اور مشکلات جاننے کے لیے ملنے آیا تھا۔

ملاقات سے قبل ہی شفیق نے ایک بات واضح کی کہ ملنا ہے تو کسی عوامی جگہ پر جہاں رش ہو یا پھر کسی کے مکان پر۔ اسی لیے میں نے کیفے کا انتخاب کیا اور کرسی بھی ذرا کونے میں لی تاکہ ہجوم میں ہوتے ہوئے بھی علیحدگی میں بیٹھ کر بات چیت ہو سکے۔

شفیق نے پہلے تو مصافحہ کیا اور پھر ہماری ٹیبل اور ارد گرد نظر ڈالی۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ ’میرے خیال میں وہ والی میز زیادہ بہتر ہے جو چار پانچ میزوں کے بیچ ہے۔‘

ہم اٹھ کر اس میز پر چلے گئے۔ سردی کے باوجود شفیق نے اپنی جیکٹ اتاری اور کرسی کے پیچھے لٹکا دی۔ میں خاموشی سے ان کے سیٹل ہونے کا انتظار کرتا رہا اور ساتھ ہی حیرت تھی کہ جیکٹ اتارنے کا مطلب؟

’میں نے اسلام آباد شہر میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہائش اس لیے اختیار کی کہ شاید دارالحکومت میں ہمیں ہمارے مذہبی عقائد کی بنا پر تنگ نظری کا سامنا نہ کرنا پڑے لیکن میں کتنا غلط ثابت ہوا۔‘

شفیق احمد تقریباً دس سال قبل ایبٹ آباد سے اسلام آباد منتقل ہوئے۔ اسلام آباد کے مضافات میں انھوں نے اپنی حیثیت کے مطابق ایک مکان کا حصہ کرائے پر لیا اور اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کیا۔

’ابتدائی طور پر یہ فیصلہ درست ہی ثابت ہوا، تعلیم کی تکمیل اور پھر ملازمت ملنے کے بعد میری زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔‘

لیکن اس مکان میں ان کو ایک سال ہی گزرا کہ محلے والوں کو آگاہی ہو گئی کہ وہ احمدی ہیں۔ اس آگاہی کے بعد ان کے لیے محلے میں رہنا مشکل ہوتا گیا۔

خیال رہے کہ پاکستان میں 70 کی دہائی میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔

شفیق کے مطابق پھر ایک صبح ایسا واقعہ ہوا کہ اس علاقے میں رہنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہو گیا۔

’میں ایک رات نوکری سے دیر سے آیا اور مجھے گھر لوٹتے ہوئے تقریباً 12 بج گئے۔ صبح فجر کے وقت میرے والد اٹھے اور سیر کے لیے جب وہ باہر نکلے تو گیٹ تھوڑا پھنس کر کھلا۔ جب انھوں نے گیٹ کو بغور دیکھا تو اس پر کئی سٹیکرز چسپاں تھے جن پر احمدی مخالف تحریر درج تھی۔‘

’ان سٹیکرز پر احمدیوں کے قتل کی دھمکیوں کے علاوہ بازار میں ہم سے لین دین پر پابندی اور مکان خالی کرنے کے مطالبات درج تھے۔ ہم نے وہ سٹیکرز تو اتار دیے مگر گھر کی فضا عجیب سی سہمی ہوئی ہو گئی۔‘

کچھ دوستوں کے مشورے سے مقامی تھانے میں رپورٹ درج کروانے کی کوشش کی تو یہ کہہ کر رپورٹ لکھنے سے انکار کر دیا گیا کہ ’بھائی جان آپ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔‘

شفیق نے بتایا کہ ان کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ وہ اس گھر سے کوچ کریں۔ جلدی جلدی میں گھر ڈھونڈاا اور مکان تبدیل کر لیا۔

’پہلے مکان میں ہم جب منتقل ہوئے تو میرے گھر کی خواتین برقع پہنا کرتی تھیں اور احمدی برقع عام برقعوں سے مختلف ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسی برقعے کی وجہ سے محلے والوں کو ہمارے مذہبی عقائد کے بارے میں علم ہوا۔ اس لیے دوسرے مکان میں جب منتقل ہوئے تو خواتین کو برقع پہننے سے منع کر دیا۔‘

ابھی وہ بات کر ہی رہے تھے کہ تقریباً شام سات بجے ان کو فون آیا۔ ’جی ابو میں دفتر سے اس کیفے پر آ گیا ایک دوست سے ملنے۔ میں تقریباً ساڑھے آٹھ بجے گھر پہنچ جاؤں گا۔‘

شفیق نے فون بند کیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ 30 سال کی عمر میں آپ کے والدین نے کتنی بار شام سات بجے فون کرنے شروع کر دیے تھے کہ کہاں پر ہو۔ ’ہماری سکیورٹی کے حوالے سے ہمارے والدین اتنے پریشان ہیں۔‘

پھر انھوں نے کیفے میں بیٹھے لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا ’ان لوگوں سے پوچھیں کتنوں کے والدین کے فون آئے ہیں کہ بیٹا حفاظت سے ہو۔ یہ صرف پھر احمدیوں کے ساتھ ہی ہے۔‘

انھوں نے کافی پیتے ہوئے اپنے مکان اور محلے والوں کی کہانی دوبارہ شروع کی اور کہا کہ کچھ ہی عرصے بعد وہی ہوا اور اس محلے میں بھی ہمارے مذہبی عقائد کے حوالے سے آگاہی ہوتے ہی محلے والوں کا رویہ تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ ’یہ سلسلہ محلے کی دکانوں پر ہونے والی گفتگو تک آن پہنچا اور ہمارے ساتھ قطع تعلق کی باتیں ہونے لگیں۔‘

اور پھر ’ہم نے ایک بار پھر سامان باندھا اور نئی منزل کی جانب چل پڑے۔ یہاں اگرچہ حالات کچھ بہتر تھے کیونکہ یہ مکان سنگل تھا اور مالک مکان ساتھ نہیں تھا مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور تاریخ دہرائی جانے لگی۔‘

لیکن اس بار بات اتنی آگے نکل گئی کہ دکانداروں نے اشیا بیچنے سے یہ کہہ کر انکار کرنا شروع کر دیا کہ ’سامان نہیں ہے۔‘

’انڈے، ڈبل روٹی وغیرہ سامنے پڑے ہوتے تھے لیکن دکاندار کہہ دیتے تھے کہ نہیں ہیں۔ میں نے حالات دیکھتے ہوئے روزمرہ کی اشیا نوکری سے واپسی پر خریدنا شروع کر دیں۔‘

بات چیت کے دوران شفیق کبھی قلم تو کبھی عینک صاف کرنے کا کپڑا تو کبھی گلے کی دوائی نکالنے کے لیے تھوڑا سا مڑ کر اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے۔ دو تین بار جب انھوں نے ایسا کیا تو مجھے سمجھ آئی کہ ان کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں بلکہ وہ اپنے پیچھے دیکھ کر مطمئن ہونا چاہتے ہیں کہ کوئی آ تو نہیں رہا۔

شفیق نے کہا ’لیکن آخر کب تک میں اسلام آباد شہر سے چیزیں خرید کر لاتا۔ اگر ایک جھاڑو بھی چاہیے ہوتا تھا تو ہمیں اپنے محلے سے دو محلے چھوڑ کر دکان پر جانا پڑتا تھا۔‘

میرے عزیز و اقارب نے مشورہ دیا کہ اسلام آباد شہر میں منتقل ہو جاؤ کیونکہ وہاں پر اس قسم کے مسئلے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ’اپنے بوڑھے والدین، اہلیہ اور بیٹی کی حفاظت اور ذہنی سکون کے لیے آخر اسلام آباد شہر کے اندر ایک مکان دیکھا اور منتقل ہو گئے۔

’کیا کھائیں اور کیا کرایہ دیں۔ تنخواہ میں سے زیادہ تر حصہ کرائے اور بلوں میں نکل جاتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر شکر کرتا ہوں کہ کم از کم محلے والے تو تنگ نہیں کرتے اور محلے کی دکان والے سامان دے دیتے ہیں۔‘

شفیق احمد نے کہا کہ زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے ’لیکن ہمدانی صاحب اگر آپ کے مکان پر قتل اور بائیکاٹ کے سٹیکرز لگا دیے جائیں تو آپ کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی؟ کیا آپ کام کر سکیں گے؟ کیا آپ کا ذہن کسی اور کام میں لگ سکے گا؟ اگر آپ دکان پر جائیں اور انڈے ڈبل روٹی سامنے پڑے ہیں اور دکاندار آپ کو کہیں نہیں ہے تو آپ کی کیا کیفیت ہو گی؟ آپ کو غصہ آئے گا جیسے کہ مجھ کو آتا تھا۔ لیکن آپ اس کے ساتھ لڑ جھگڑ لیں گے لیکن میں ایک بطور احمدی لڑنے کی جرات نہیں کر سکتا محض اس ڈر سے کہ انڈے ڈبل روٹی کے پیچھے جان نہ جائے۔‘

یہ جاننے کے لیے کہ کیا احمدیوں کے لیے مکان کرائے پر لینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ شفیق نے بیان کیا میں بھی پراپرٹی ڈیلرز کے پاس گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے ایک احمدی دوست کو مکان کرائے پر چاہیے۔

ایک پراپرٹی ڈیلر چوہدری کرامت نے کہا: ’اگر آپ کا دوست اسلام آباد کے متوسط یا نچلے درجے کے متوسط علاقے میں مکان چاہتے ہیں تو وہ اپنا عقیدہ مالک مکان کو نہ بتائیں اور ان کو مکان حاصل کرنے میں کوئی مسئلہ درپیش نہیں آئے گا۔ لیکن اگر آپ کا دوست اپنا عقیدہ بتانا چاہتا ہے تو پھر ان کو مکان اسلام آباد کے پوش علاقے میں دیکھنا چاہیے۔‘

دکانداروں کا موقف

بات صرف شفیق احمد اور دیگر احمدیوں کو عام دکان سے سامان نہ ملنے تک ہی محدود نہیں رہی ہے۔ اب تو کچھ عرصے سے بات اس حد تک نکل چکی ہے کہ لاہور جیسے بڑے شہر کے وسط میں واقع شہر کے بڑے کاروباری پلازہ حفیظ سینٹر میں تقریباً تمام ہی دکانوں پر احمدی مخالف سٹیکرز چسپاں ہیں۔

حفیظ سینٹر ہی میں 2015 میں پولیس نے کارروائی کی تھی اور احمدیوں کے خلاف چسپاں سٹیکرز نہ صرف اتارے تھے بلکہ ایک دکاندار کو نفرت انگیز مواد لگانے کے الزام میں گرفتار بھی کیا۔

یاد رہے کہ نیشنل ایکشن پلان کے تحت نفرت انگیز مواد کی تشہیر جرم ہے۔ لیکن اس بڑے الیکٹرانک مارکیٹ کے پلازے میں ایک بار پھر سے سٹیکر نمایاں طور پر چسپاں ہیں۔

تقریباً ہر دکان کے باہر ایک ہی سٹیکر چسپاں ہے جس پر لکھا ہے ’قادیانیوں کا داخلہ اور کاروبار ممنوع ہے‘۔

’احمدیوں کا داخلہ اور کاروبار ممنوع‘ کے سٹیکر کے بارے میں جاننے کے لیے ایک ذیشان نامی دکاندار سے بات کی تو ان کا کہنا تھا ’اس سٹیکر کو دیکھ کر کبھی بحث نہیں ہوئی۔ جو دیکھتا ہے آگے چلا جاتا ہے۔ کسی نے آ کر یہ نہیں کہا کہ یہ سٹیکر کیوں لگایا ہوا ہے۔‘

ان سے جب پوچھا کہ سٹیکر کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ احمدیوں کے علاوہ بھی وہ لوگ جو احمدیوں کے ساتھ ایسے سلوک کے مخالف ہوں وہ بھی دکان میں نہ آئیں اور کاروبار میں کمی ہوجائے تو انھوں نے کہا ’رزق دینے والا اللہ کی ذات ہے۔‘

بہت سارے دکانداروں سے جب یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ آیا وہ یہ سٹیکر خود چھپواتے ہیں تو ان کا کہنا تھا کہ نہیں کچھ لوگ آتے ہیں اور دے جاتے ہیں اور وہ اپنی خوشی سے یہ سٹیکر دکان کے باہر دروازوں یا کھڑکیوں پر نمایاں طور پر چسپاں کرتے ہیں۔

حفیظ سینٹر ہی میں ایک دکاندار شیخ مدثر نواز کا کہنا ہے کہ کئی بار دکان پر لوگ آئے ہیں اور سٹیکر دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ سٹیکر کیوں لگایا ہوا ہے۔ ’ہم کہتے ہیں کہ قادیانیوں کے ساتھ کاروبار نہیں کرنا تو انھوں نے کہا کہ وہ قادیانی ہیں تو ہم نے صاف کہہ دیا فون فروخت نہیں کرنا۔‘

جب ان سے کاروبار میں کمی کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے ایک واقعہ سنایا۔ ’دولڑکے آئے تھے فون خریدنے تو جو فون ان کو پسند تھے وہ کام ہی نہ کریں۔ جب وہ لڑکے چلے گئے تو ساتھ والی دکان کا لڑکا میرے پاس آیا اور کہا کہ یہ دولڑکے تو وہ ہیں جو درخت کے نیچے سے گزر جائیں تو اس کی جھاڑ خشک ہو جاتی ہے کیونکہ یہ احمدی تھے۔ اس لڑکے نے مجھ سے کہا کہ وہی فون دوبارہ ٹرائی کرواور جب میں نے کیے تو فون چل پڑے۔ اب آپ ہی مجھے بتائیں کہ میں ان کے ساتھ کاروبار کیوں کروں؟‘

احمدی برادری کی جانب سے جاری کی گئی سالانہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سنہ 1984 میں احمدی مخالف قوانین کے اطلاق کے بعد سے دسمبر سنہ 2017 تک 264 احمدیوں کو ان کے عقیدے کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ اس دوران احمدیوں پر 379 حملے ہوئے جبکہ 27 عبادت گاہوں کو تباہ اور 33 کو بند کیا گیا۔

احمدی برادری کی ٹارگٹ کلنگ اور ان کی عبادت گاہوں پر حملے کئی دہائیوں سے جاری ہیں۔ فوجی آمر جنرل ضیا الحق کے بعد آنے والی سویلین حکومتیں احمدیوں کو تحفظ دینے میں ناکام رہی ہیں۔

عمران خان کی حکومت جو ’نیا پاکستان‘ کے نعرے کے ساتھ حکومت میں آئی نہ صرف احمدی برادری کو تحفظ دینے میں ناکام رہی ہے بلکہ اس کی جانب سے اٹھائے جانے والے اقدامات سے مذہبی جماعتوں کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

عمران خان نے معاشی مشاورتی کونسل میں ماہر معاشیات عاطف میاں کو شامل کیا۔ ان کی شمولیت پر عوام کی نمائندگی کا نعرہ لگانے والی مسلم لیگ نواز نے سینیٹ میں میاں عاطف کے احمدی ہونے اور کونسل میں شامل کرنے کے خلاف تحریک استحقاق جمع کرائی۔ ابتدائی طور پر پاکستان تحریک انصاف کی حکومت نے عاطف میاں کا دفاع کیا کہ ’پاکستان جتنا اکثریت کا ہے اتنا ہی اقلیتوں کا ہے‘۔ تاہم جلد ہی اس نے گھٹنے ٹیک دیے اور میاں عاطف کو کونسل سے مستعفی ہونے کا کہا۔

احمدیوں کے لیے پاکستان میں جگہ تنگ ہوتی جائے گی اگر ریاست کا ایک ستون انتظامیہ ان کے ان حقوق کے لیے کھڑا نہیں ہوتا جو اس ملک کے آئین میں درج ہیں۔ اور دوسرا ستون مقننہ مذہبی جماعتوں کے دباؤ میں گھٹنے ٹیک دے تو وہ بھی اسی مہم کا حصہ بن جاتا ہے جو احمدیوں کے لیے زمین تنگ کر رہی ہے۔

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لئے مختصر دورانیئے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی،........ ہو۔ ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ........ اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

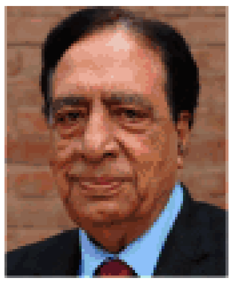

جھوٹے مسلمان، جھوٹے پاکستانی!

تحریر عطاء الحق قاسمی

ایک عیالدار شخص ایک حاجی صاحب کے پاس گیا اور انہیں بتایا کہ دو ماہ بعد ان کی بیٹی کی شادی ہے، اس نے تین لاکھ روپے شادی کے لئے جمع کئے ہوئے ہیں یہ رقم اپنے پاس امانت رکھ لیں، وہ دو ماہ بعد ان سے لے جائے گا۔ حاجی نے رقم لی اور کہا ''یہ میرے پاس آپ کی امانت ہے، آپ جب چاہیں واپس لے جائیں'' دو ماہ بعد وہ شخص واپس حاجی صاحب کے پاس آیا اور اپنی رقم واپس مانگی، حاجی صاحب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''عزیزم! کونسی رقم؟'' اس شخص نے کہا ''جناب جو میں آپ کے پاس رکھوا کر گیا تھا۔'' حاجی صاحب نے فرمایا ''عزیزم آپ کو غلطی لگی ہے، آپ نے میرے پاس کوئی رقم نہیں رکھوائی۔ اس شخص نے کہا ''حاجی صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جب میں نے آپ کو تین لاکھ روپے دیئے اس وقت آپ کے یہ تینوں بیٹے بھی آپ کے پاس بیٹھے تھے۔'' حاجی صاحب بولے پھر تو مسئلہ حل ہوگیا، ان سے پوچھ لیتے ہیں اگر یہ کہیں کہ آپ نے رقم دی تھی تو آپ کی امانت آپ کو واپس مل جائے گی، پھر انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کو مخاطب کیا۔

کیوں بھئی حاجی نعیم ان صاحب نے میرے پاس کوئی رقم کھوائی تھی۔

نہیں والد محترم!

کیوں بھی حاجی نسیم تمہارے سامنے ان صاحب نے مجھے کچھ رقم دی تھی، حاجی صاحب نے درمیان والے بیٹے سے استفسار کیا۔

نہیں والد محترم میں تو ان کی شکل ہی آج دیکھ رہا ہوں۔

تم بتاؤ محمد حسن، انہوں نے تین لاکھ روپے مجھے دیئے تھے۔ حاجی صاحب نے آخر میں سب سے چھوٹے بیٹے سے پوچھا۔

جی والد محترم انہوں نے میرے سامنے آپ کو تین لاکھ روپے دیئے تھے۔

اس پر حاجی صاحب نے اپنے تینوں بیٹوں کی طرف دیکھا اور کہا حاجی نعیم حاجی نسیم، ان صاحب کے تین لاکھ روپے انہیں واپس کرواور محمد حسن کو فوراً حج پر بھجواؤ۔

بظاہر یہ لطیفہ ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اس وقت اسی قسم کے جعلی اسلام دوستوں کے شکنجے میں پھنسا ہوا ہے جو عبادات اور معاملات کو الگ الگ چیزیں سمجھ بیٹھے ہیں، اگر کوئی شخص امانت میں خیانت کرتا ہے، جعلی ادویات کے کاروبار میں ملوث ہے، کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کرتا ہے، اسمگلنگ اور ہیروئن فروشی کا کاروبار کرتا ہے، کسی کے حقوق غصب کرتا ہے، یتیم اور مسکین کا مال کھاتا ہے، پلاٹوں پر قبضے کرتا ہے، ناجائز منافع اور ذخیرہ اندوزی سے دولت کماتا ہے اور ظالم کا ساتھ دیتا ہے اللہ تعالیٰ کو اس شخص کی نمازوں اور روزوں سے کوئی غرض نہیں، ناجائز ذرائع سے کروڑوں روپے ڈکارنے والوں کی دو چار ہزار کی دیگ بھی اللہ تعالیٰ کو قبول نہیں جو وہ داتا صاحب جا کر چڑھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایسا مخیر بھی پسند نہیں جو لوٹ مار کے مال میں عمرے کرتا ہے اور دینی مدرسوں کو چندے دیتا ہے۔ خدا کے نزدیک وہ آنسو بھی مگرمچھ کے آنسوؤں میں شمار ہوتے ہیں جو اس نوع کے بدکردار لوگ جھوم جھوم کر نعت سننے کے درمیان بہاتے ہیں مگر آپ یقین کریں ہمارا معاشرہ یہ سب باتیں بھول چکا ہے۔ بعض مذہبی پیشوا انہیں یقین دلا چکے ہیں کہ تم سب حرام کاریاں کرو بس ہر گناہ کے بعد نماز پڑھ کر اس گناہ کی معافی مانگ لیا کرو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے دامان رحمت میں جگہ دے گا، حالانکہ یہ معافی صرف عبادات میں ہونے والی کوتاہی میں ممکن ہے، معاملات میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نیکوکاروں کے علاوہ اول درجے کے ملک دشمنوں اور معاشرے کے روگیوں کی دکانوں اور گھروں میں بھی یہی تختی لگی ہوئی ہے ''یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے'' میرے نزدیک یہ توہین رسالت ہے اور ایسے لوگوں کے خلاف توہین رسالت کے قانون کے تحت کارروائی ہونا چاہئے۔ اسلام کے ان جعلی دوستوں کے علاوہ پاکستان کے جعلی دوست بھی ہمارے ہاں کثیر تعداد میں موجود ہیں بلکہ میرے نزدیک یہ اکثریت میں ہیں۔ ہمارے ذاتی مفادات کے سامنے پاکستان کے مفادات کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ سور نے صرف گنے کی گٹھلی کھانا ہوتی ہے مگر اس کے لئے وہ کماد کا سارا کھیت برباد کر دیتا ہے۔ ہم 14 اگست کو سائیکلوں، موٹر سائیکلوں، کاروں، ویگنوں اور اپنے گھروں پر پاکستان کا جھنڈا لہراتے ہیں۔ پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں۔ عام گفتگوؤں میں ملک کی حالت زار پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ ہمارے حکمران پرچم کشائیاں کرتے ہیں، قوم کو حب الوطنی کا درس دیتے ہیں اور محب الوطنوں کو غدار قرار دیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ان کا اپنا کون سا عمل ان کے محب وطن ہونے کی گواہی دیتا ہے، صرف پاکستان زندہ باد، دل دل پاکستان، جیوے جیوے پاکستان کہنا تو بہت آسان

ہے، مگر بقول اقبال۔

زبان سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

اہل سنت کہلوانے والوں میں سے کون ہے جو حضورؐ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے مظلوموں کے لئے میدان میں اترتا ہے۔ اہل حدیث کہلوانے والوں میں سے کون ہے جو حضورؐ کی اس حدیث پر عمل کرتا ہے کہ بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔ اہل تشیع میں سے کون ہے جو حضرت امام حسینؓ کے رستے پر چلتے ہوئے اپنے عہد کے یزید سے ٹکر لیتا ہے، اسلام سے محبت کے صرف دعوے، پاکستان سے محبت کے بھی صرف دعوے اور اصل محبت صرف اپنے آپ سے؟ ہم سب اسلام اور پاکستان کے جعلی دوست ہیں اگر ہم اسلام دوست ہیں تو نقلی مسلمانوں کے ہاتھوں اسلام کی بربادی کا تماشا کیوں دیکھتے ہیں اور اگر ہم پاکستان دوست ہیں تو طالع آزماؤں کے ہاتھوں پاکستان کی بربادی کا تماشا کیوں دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ انصاف کی دھجیاں اڑتے کیوں دیکھتے ہیں۔ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ ہے مگر ہمیں پاکستان سے زیادہ اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات عزیز ہیں۔ اپنا رتبہ اور منصب عزیز ہے۔ حرام ذرائع سے بنایا ہوا مال عزیز ہے۔ میرے مولا یہ رتبہ یہ منصب اور مال اُن سے چھین لے جنہیں یہ رتبہ، منصب اور مال پاکستان سے زیادہ عزیز ہے۔

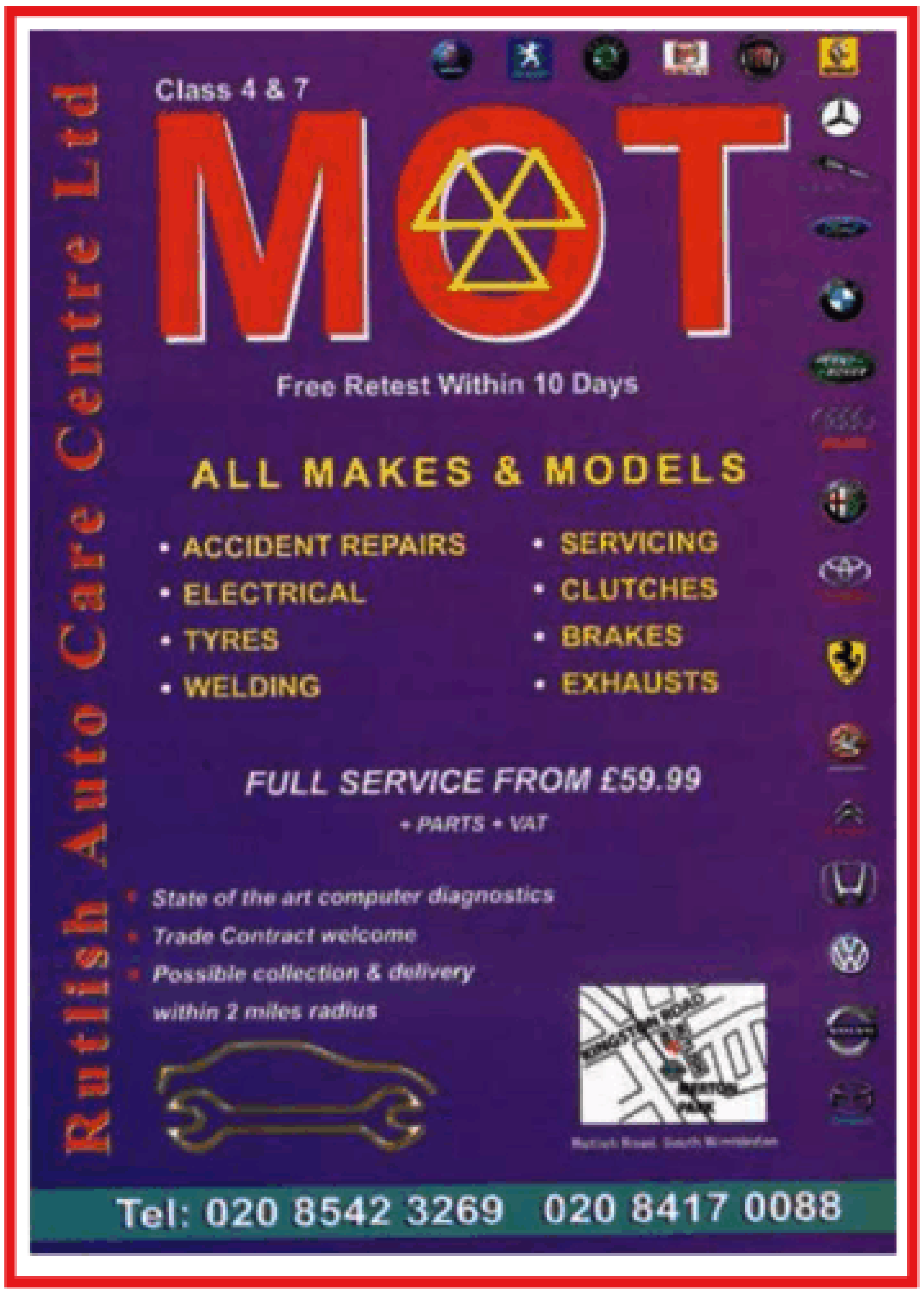

London View Chambers
... your barristers

Skilled in Capital Markets & Securities; proficient in Corporate Finance; expert in Banking regulation; specialist in Competition policy & legislation; experienced in Public Law judicial review challenges; professionally qualified as Barristers in England and Advocates in Pakistan.Welcome to London View champers.

Tel: 02071834797

e-mail: Clerks@londonviewchambers.co.uk

جعل سازی کے امکانات روشن ہو گئے

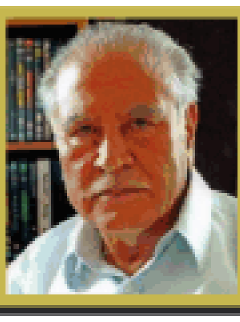

تحریر رضا علی عابدی

میری جوانی اخبار نویسی میں گزری۔ اس دوران کیسے کیسے منظر دیکھے، بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک بات جو ہر روز سننے میں آتی تھی وہ یہ کہ لوگ ایک روز بیان جاری کرتے اور اگلے روز مکر جاتے۔ یہ ایک معمول سا بن گیا تھا۔ اُس کے بعد جو جملہ سننے میں آتا تھا اور آج تک آتا ہے وہ یہ تھا کہ میرا بیان توڑ مروڑ کر شائع کیا گیا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب خبر رسانی کا سب سے بڑا ذریعہ چھپا ہوا اخبار ہوا کرتا تھا۔ بے چارے نامہ نگاروں اور رپورٹروں پر ہمیشہ یہ الزام دھرا جاتا تھا کہ انہوں نے بیان توڑ مروڑ کر شائع کیا ہے۔

اب جو وہ فرسودہ نظام ختم ہوا اور کیا تحریر، کیا تصویر، کیا آواز اور کیا بدن کی حرکات وسکنات، سب یوں محفوظ ہونے لگیں کہ تردید یا انکار کرنے کی گنجائش نہیں رہی، لوگ اب تک وہی بھونڈی شکایت دہراتے ہیں، وہی توڑنے مروڑنے والی بات لیکن اب تو لوگوں کی کہی ہوئی بات یوں محفوظ ہو جاتی ہے کہ انکار کرنے یا منحرف ہونے کا امکان نہیں رہتا۔ یوں سمجھئے کہ کسی بااختیار شخص نے کسی عدالت کے منصف کو ٹیلی فون پر کہا کہ فلاں شخص کو ذرا سخت سزا دینا۔

آج کل کے برقی آلات ایسے چالباز ہو گئے ہیں کہ اس طرح کی ٹیلی فونی گفتگو محفوظ کر لیتے ہیں اور اگر وہ گفتگو نشر ہو جائے تو وہ اتنی سچی اور حقیقی گواہی ہوتی ہے کہ اس پر دروغ گوئی کا الزام نہیں لگ سکتا۔ گفتگو کرنے والے کو انکار یا تردید کرنے کی جرأت نہیں ہوتی اور وہ بات ایک ایسی گہری لکیر بن جاتی ہے جو کسی پتھر پر کھودی گئی ہو۔ مثلاً میں اگر کہہ دوں کہ لندن تو کیا، پاکستان میں بھی میری کوئی جائیداد نہیں تو میری یہ بات پھر مٹ نہیں سکتی۔

پھر میڈیا میرے اس ایک فقرے کو اس طرح بار بار دہرا سکتا ہے جیسے ایک ہی زخم پر ہر روز نمک چھڑکا جا رہا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ میں پھر ایسا بھولا اور نادان بن جاؤں جیسے میں نے یہ بات کبھی کہی ہی نہیں تھی۔ اس میں ذرا سا حیا کا معاملہ ہے مگر ان دنوں حیا نے دل و دماغ میں چٹکیاں لینا چھوڑ دیا ہے، کس کو پڑی ہے کہ اپنے کہے پر نادم اور شرمسار ہو۔ لوگ دلیر ہو گئے ہیں لیکن ان باتوں سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جدید ٹیکنالوجی آ جانے کے بعد حقیقت کو توڑنا مروڑنا ممکن نہیں رہا۔

سچ تو یہ ہے کہ جیسی ہیرا پھیری اور جعل سازی اب ہوتی ہے، گزرے وقتوں میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اِدھر کا بیان اٹھا کر اُدھر چپکا دینا، یہاں کا فقرہ نکال کر وہاں چسپاں کر دینا، زیر زبر بدل دینا، لفظ مٹا دینا، فقرہ حذف کر دینا، عبارت کو تہ و بالا کر دینا، اب بیحد آسان ہو گیا ہے اور اگر آپ بوڑھے ہو گئے ہیں اور یہ ہیرا پھیری نہیں کر پا رہے تو گھر کے لڑکے لڑکیوں سے کہئے، وہ پلک جھپکتے میں کر دیں گے۔

یہ تو خیر تحریر کی بات ہوئی، تقریر میں بھی اتنی الٹ پھیر ہو سکتی ہے کہ تقریر والا خود سنے تو حیران رہ جائے کہ اُس نے یہ سب کہا ہی نہیں تھا۔ الفاظ آگے پیچھے اور فقرے اوپر نیچے کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اسی طرح آواز کا بدلنا، میری آواز کو بھاری بھرکم کرنے یا باریک یا نسوانی بنا دینے میں بس اتنا ہی وقت لگتا ہے جتنا پلک جھپکنے میں۔ میرا بی بی سی کا زمانہ پرانی ریل پر چلنے والے ٹیپ کا دور تھا۔ ساری ریکارڈنگ ایک چرخی سے کھل کر دوسری چرخی پر لپٹنے والے فیتے پر ہوتی تھی۔ اس میں ساری کاٹ چھانٹ کے لئے ٹیپ یا فیتے کو بلیڈ سے کاٹا جاتا تھا۔ ایک لفظ نکالنا ہو یا ایک فقرہ، وہ سب کچھ بلیڈ سے کاٹ کر نکالا جاتا تھا۔

پھر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ اس ساری دقیانوسی چرخی کاری کی جگہ سامنے میز پر رکھے ہوئے کمپیوٹر کے پردے پر آوازیں یوں نمودار ہو گئیں کہ وہ نہ صرف سنائی دیتی تھیں بلکہ لہروں کی شکل میں دکھائی بھی دیتی تھیں۔ بس پھر آپ پوری طرح آزاد تھے کہ آواز کے ساتھ جیسی اکھاڑ پچھاڑ کرنا چاہیں، شوق سے کریں۔ یہاں کی بات وہاں اور وہاں کی آواز یہاں چسپاں کرنے کیلئے بس ایک بٹن دبانا ہوتا تھا۔ (شکر ہے اُن ہی دنوں میں ملازمت سے سبک دوش ہو گیا)۔

تحریر اور تقریر کے بعد تصویر کا تو بس کچھ نہ پوچھئے۔ جتنی جعل سازی اور ڈھونگ بازی تصویر میں ہو سکتی ہے اس کو بیان کرنا تو کیا، تصور کرنا بھی دوبھر ہے۔ ادھر کیمرہ شاپ نام کی کوئی بلا ایجاد ہو گئی ہے۔ اس سے تو خدا سب کو محفوظ رکھے۔

اس میں ڈال کر آپ تصویر کے ساتھ وہی سلوک کر سکتے ہیں جو گائے اپنی جگالی کے ساتھ کرتی ہے۔ اسے بگھاریئے، ابالئے، کھنگالئے، نتھاریئے اور انسان کو پلک جھپکتے میں گدھا بنا دیجئے۔

جس کے سر پر چاہے سینگ اگا دیجئے یا سامنے کے دو دانتوں کو ڈریکولا جیسے خون چوسنے والے دانت بنا دیجئے۔ ہم نے ٹیلی وژن پر ایسے منظر دیکھے ہیں جو کبھی وجود ہی میں نہیں آئے لیکن اسکرین پر یوں نظر آئے جیسے سچ مچ ظہور میں آئے ہوں۔ اس سارے کام کے لئے آپ کا مصور یا کاریگر ہونا ضروری نہیں۔ بس کی بورڈ پر دوڑتی ہوئی انگلیاں ایسی ایسی کرامات دکھا سکتی ہیں کہ انسان ایک لمحے میں فرشتہ اور دوسرے میں شیطان نظر آ سکتا ہے۔

ان سارے کمالات کے بعد جعل سازوں کے مزے آ گئے ہیں۔ آپ دنیا کی جو دستاویز چاہیں چھاپ کر نکال سکتے ہیں۔ کسی عظیم درس گاہ کی سند ہو یا کسی ملک کی بڑی سے بڑی مالیت کی کرنسی، بس وہی ایک بٹن دبایئے، محبوب آپ کے قدموں میں ہوگا۔

ان حالات میں عدالتوں کا کام دشوار ہوا جاتا ہے۔ کیا اصلی ہے کیا جعلی، کیا حقیقی ہے کیا فرضی، بادی النظر یا کسی بھی نظر میں کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ اب آپ سارا تام جھام اٹھا کر کسی جدید لیبارٹری میں جایئے، وہاں ماہرین مل کر سر کھپائیں اور فرانزک ٹیسٹ کریں تو پتا چلے کہ اس میں کتنا جھوٹ ہے اور کتنا مہا جھوٹ۔

پھر بھی کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ پانی کا پانی ہوا، وہ بھی گندے جوہڑ کا، یا دودھ کا دودھ، وہ بھی پھٹا ہوا۔ (بشکریہ روزنامہ جنگ)

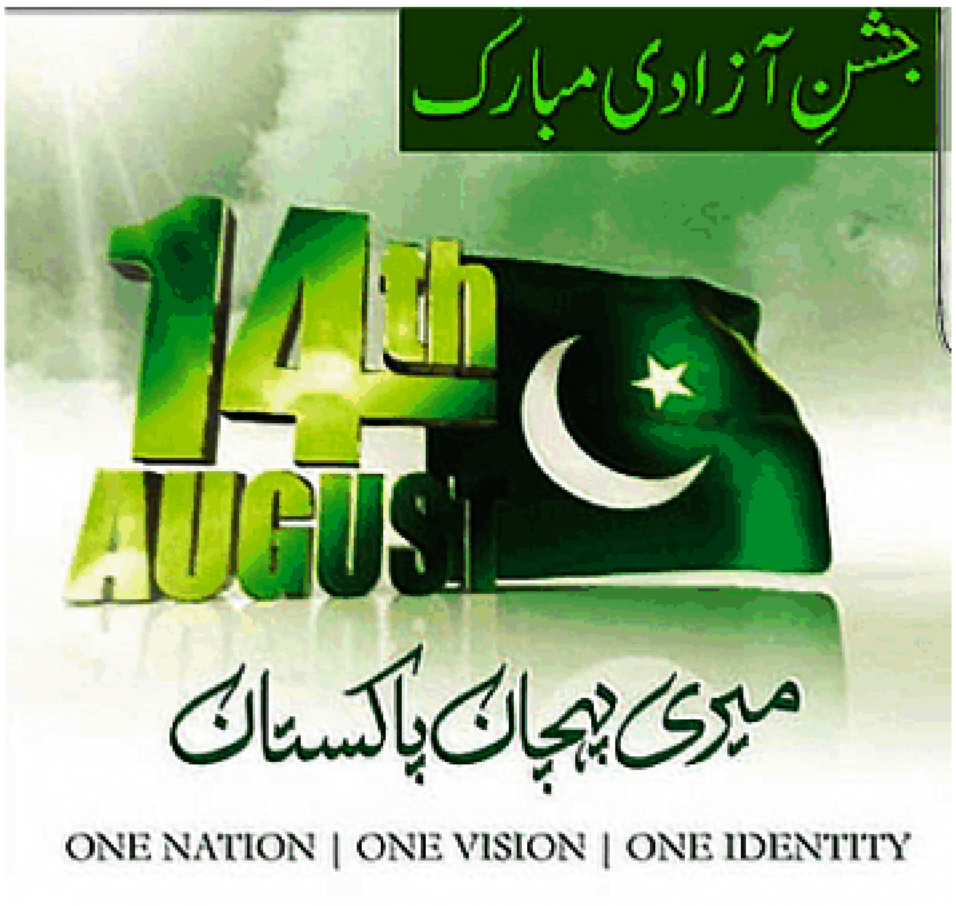

قارئین کے لئے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور نے قارئین کے لئے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ" پُرعزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاء اللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدردانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد "ہفتہ وار" کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

نزہت صدیقی ٹورنٹو

ہر سمت زندگی تھی نشہ تھا سرور تھا
جب کائنات دل میں تمہارا ظہور تھا
ہم بے حسی کی جھیل میں اترے تمہارے بعد
احساس کا شعور تمہارے حضور تھا
کچھ التفات وقت تھا کچھ مصلحت کی بات
میرا قصور تھا، نہ تمہارا قصور تھا
جو بھی ملا حیات کی پرخار راہ میں
وہ درد سے نڈھال تھا زخموں سے چور تھا
کتنے عجیب ہیں یہ تمنا کے سلسلے
جتنا قریب آیا وہ اتنا ہی دور تھا
کیسے کروں شکایت بے مہری حیات
میرا رقیب خود مرا اپنا شعور تھا

جب گوجرانوالہ کے شہریوں پر برطانوی جہازوں نے بمباری کی

تحریر ثقلین امام

یوں تو ایک دشمن پر ہوائی بمباری یا آتش گیر مادہ پھینکنے کی ایک پرانی تاریخ ہے، لیکن شاید گوجرانوالہ وہ پہلا شہر قرار دیا جا سکتا ہے جہاں نہتے عوام کے مظاہروں کو کچلنے کے لیے پہلی ایریئل پولیسنگ یعنی ہوائی بمباری کا استعمال کیا گیا۔

گوجرانوالہ جو کہ اب پاکستان کے پنجاب کا ایک شہر ہے، میں 14 اپریل 1919 کی دوپہر کو لاہور والٹن کے ایئر پورٹ سے اڑنے والے تین فوجی جہازوں نے نہتے مظاہرین پر قابو پانے کے لیے بمباری کی۔ اس سے پہلے ہوائی بمباری زمینی فوج کے تعاون سے دشمن کی فوج یا فوجی اہداف پر کی جاتی تھی۔

برطانوی ائرفورس نے عراق میں عوامی بغاوت کو کچلنے کے لیے بمباری سنہ 1920 میں کی تھی جسے برطانوی رہنما ونسٹن چرچل نے 'ایریل پولیسنگ' کا نام دیا تھا

گوجرانوالہ کی بمباری کے بعد اس ہوائی طاقت یا ایریل پولیسنگ کو سیاسی مقاصد کے لیے نہتے شہریوں پر استعمال برطانوی پالیسی کا حصہ بنا۔ ایریل پولیسنگ کے لفظ کا استعمال سب سے پہلے برطانوی سیاست دان ونسٹن چرچل نے کیا تھا جب 1920 میں عراق میں شیعہ اور سنی نہتے عوام نے برطانوی کنٹرول کے خلاف مظاہرے کیے تھے۔

پھر اس بمباری کو ایک ایریل پولسنگ کے حربے کے طور پر صومالیہ میں بھی استعمال کیا گیا۔ اور یہ مختلف صورتوں میں اب بھی استعمال ہو رہی ہے۔

گوجرانوالہ میں بمباری کا پس منظر

جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام سفاکی اور ظلم کے لحاظ سے برطانوی غلامی کے دور کا ایک بدترین واقعہ ہے، جسے اگلی نسلیں کبھی بھول نہیں پائیں گیں۔

برطانوی حکمران رولٹ ایکٹ 1919 کے خلاف ہونے والے عوامی ردِعمل کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے تھے۔ برٹش انڈین حکمران اپنی پوری طاقت کو استعمال کر کے اس وقت کی عوامی بغاوت کو کچلنا چاہتے تھے۔

اس طاقت کے استعمال کی پالیسی سے کئی شہری ہلاک ہوئے، کتنے ہی زخمی ہوئے اور سیاسی عدم استحکام بھی بڑھا۔ ہندوستان کی برطانوی آبادیاتی لیجیسلیٹو کونسل نے پہلی جنگِ عظیم کے فوری بعد ایک ایسے قانون کی منظوری دی جو تمام شہری حقوق اور پریس کی آزادی کو کچل دیتا تھا۔ اس قانون کے مطابق، قانون نافذ کرنے والے اداروں کو گرفتار کرنے اور سیاسی ورکرز کو جیل میں رکھنے کی بے انتہا طاقت دے دی گئی تھی۔

اس قانون کا نام انارکِکل اینڈ رِوولیوشنری کرائمز ایکٹ 1919 تھا لیکن یہ قانون کے بل کو بنانے والے برطانوی جج سر سڈنی رولٹ کے نام سے رولٹ ایکٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ ہندوستان کے کئی سیاسی رہنماؤں نے اس قانون کی مخالفت کی تھی۔ پاکستان کے بانی محمد علی جناح لیجیسلیٹو کونسل سے احتجاجاً مستعفی بھی ہو گئے تھے۔

اس قانون کے خلاف ہونے والے احتجاج اور پھر ہلاکتوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی کارکردگی کے جائزے کے لیے برطانوی حکومت نے ایک انکوائری کمیٹی بنائی تھی جس کا نام ڈس آرڈر انکوائری کمیٹی تھا اور اس کے سابق سولیسٹر جنرل آنرایبل لارڈ ہنٹر سربراہ تھے۔

گوجرانوالہ پر بمباری کے واقعہ کا ذکر پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ میں کم ہی آتا ہے۔ اس لیے اس واقعے کی تفصیلات اسی انکوائری کمیٹی سے حاصل کی گئیں ہیں۔ اس انکوائری کمیٹی میں متحدہ ہندوستان کی سنہ 1919 کی سیاسی شورشوں کا ذکر ہے لیکن یہاں صرف گوجرانوالہ پر ہوائی بمباری پر کی گئی انکوائری کے حصوں کی تلخیص بیان کی گئی ہے۔

بمباری سے پہلے کا گوجرانوالہ

لاہور سے تقریباً 40 میل دور تقریباً 30 ہزار افراد کے شہر گوجرانوالہ میں ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ پانچ اپریل 1919 کو ایک مقامی سیاسی اجلاس میں رولٹ ایکٹ کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں منظور ہونے والی قرارداد میں دلی کے حکمرانوں کی جانب سے رولٹ ایکٹ کے خلاف عوامی مظاہروں پر فائرنگ کی شدید مذمت کی گئی تھی۔ مختلف شہروں میں رہنے والے فائرنگ کے ان واقعات سے متعدد افراد ہلاک ہوئے تھے۔

اسی اجلاس میں منظور ہونے والی قرارداد میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ چھ اپریل کو قومی سطح پر یومِ احتجاج منایا جائے اور اس دن ہر شخص 24 گھنٹوں کا روزہ رکھے اور سارا دن ہر قسم کا کاروبار بند کر دے۔

اس وقت گوجرانوالہ کے ڈپٹی کمشنر، کرنل اوبرائین نے اس ہڑتال کے خلاف سخت کاروائی کا اعلان کیا تھا۔ تاہم یہ ہڑتال پُرامن رہی۔ 12 اپریل کو کرنل اوبرائین کا تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ خان بہادر مرزا سلطان احمد کو گوجرانوالہ ڈسٹرکٹ کا عارضی چارج دیا گیا۔

اس دوران ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں کی طرح پنجاب کے کئی شہروں میں بھی رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ جاری تھا۔ دس اپریل تک گوجرانوالہ میں مزید مظاہروں کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ لیکن لاہور اور امرتسر کے مظاہروں پر گولیاں چلانے اور ہلاکتوں کی خبریں آنے کی وجہ سے اشتعال بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔

تاہم جب تیرہ اپریل کے روز جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کی خبریں افواہوں کی صورت میں پھیلنے لگیں تو پھر ایک عوامی ردِعمل آنا یقینی نظر آ رہا تھا۔ لیکن ضلعی انتظامیہ کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ ردِعمل اتنی شدت کا ہوگا کہ اسے قابو کرنا مشکل ہو جائے گا۔ پھر بھی جتنی بھی پولیس کی تعداد ممکن تھی ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں جمع کر لی گئی تھی۔

انتظامیہ کو حالات کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈپٹی کمشنر نے گوجرانوالہ میں امریکی مشنریز کو یہ پیغام بھجوایا کہ وہ جلیانوالہ باغ واقعے کے ردِعمل کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے تاکید کرتے ہیں کہ اس میں کام کرنے والی عورتوں کو عارضی طور پر شہر سے باہر محفوظ مقام پر منتقل دیا جائے۔

امریکی مشنریز کے بڑوں نے اس تجویز پر عملدرآمد کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن گوجرانوالہ کے سپرنٹنڈینٹ پولیس، مسٹر ہیرون نے اس بات پر دوبارہ اصرار کیا۔ اس مشنری کے ایک سینیئر اہلکار کیپٹن گوڈفرے کا گوجرہ جانے کا سفر پہلے سے طے شدہ تھا۔ انھوں نے اپنے ہمراہ اپنے اہلِ خانہ کو لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر رات گئے امریکہ مشنری کا سارا عملہ روانہ ہو گیا۔

بمباری والے دن کی صبح

14 اپریل کی صبح گوجرانوالہ ریلوے سٹیشن کے قریب کچے پُل پر کسی نے گائے کے بچھڑے کو ہلاک کر کے لٹکا دیا تھا۔ جیسے ہی یہ خبر ملی تو اس وقت کے پولیس کے ڈپٹی سپرنٹینڈنٹ پولیس، چوہدری غلام رسول موقع پر پہنچے اور بچھڑے کو اتار کر دفنایا۔ لیکن شہر میں افواہ یہ پھیل گئی کہ ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کے لیے انتظامیہ نے خود ہی یہ بچھڑا ہلاک کر کے لٹکا دیا تھا۔

اس کے بعد دن میں گوجرانوالہ شہر کے مختلف حصوں میں ہجوم جمع ہونا شروع ہو گئے جنھوں نے دوکانوں کو بند کروانا شروع کر دیا۔ یہ لوگ رولٹ ایکٹ کے خلاف اور ہندو مسلم اتحاد کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ شہر میں پھیلے ان لوگوں کے مظاہروں میں شدت آتی چلی جا رہی تھی۔ ٹرینوں پر پتھروں سے حملے ہوئے، ایک پل جو گورو گل کے نام سے مشہور تھا، کو جلا دیا گیا۔ ٹیلی گراف اور ٹیلیفون کے نظام کا لاہور سے تعلق ٹوٹ گیا جس سے انتظامیہ میں گھبراہٹ بڑھ گئی۔

اشتعال بڑھنے کے بعد کچے پُل پر بھی آگ لگائی گئی جس سے پل کو کافی نقصان پہنچا۔ پولیس گارڈز پر حملے ہوئے جن کی مدد کے لیے ڈپٹی سپرنٹینڈنٹ آف پولیس نے فورس بھیجی۔ ان کی مدد کے لیے اس وقت کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر آغا غلام حسین بھی کاروائی میں شامل ہو گئے۔ کچے پل کے قریب ایک بڑا ہجوم جمع تھا۔ پولیس سربراہ مسٹر ہیرون بھی موجود تھے۔ وہاں لوگ پولس سے مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ ہندوستانی عوام کو اپنا ہیٹ اتار

کر سلام کرے۔ اس دوران تصادم کا خطرہ پیدا ہوا اور پولیس نے فائرنگ کی جس سے کئی افراد زخمی ہوئے۔

اس واقعے کے بعد شہر میں کشیدہ حالات بد سے بدتر ہونا شروع ہو گئے۔ سٹیشن پر تقریریں ہونا شروع ہو گئیں جن میں رولٹ ایکٹ کے خلاف باتیں کی گئیں اور ہندو مسلم اتحاد کے حق میں بہت نعرے لگائے گئے۔ اس دوران شہر کے مرکزی پوسٹ آفس کو بھی نذرِ آتش کر دیا گیا۔ ہنٹر انکوائری کمیشن نے ابتری کی ذمہ داری نئے ڈپٹی کمشنر پر عائد کی کیونکہ وہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے بروقت اہم اقدامات نہ کر سکے۔

اسی دوران شہر میں لوگوں کی مختلف ٹولیوں نے تحصیلدار کے دفتر پر حملہ کیا، پھر لوگ ضلعی عدالتوں اور دوسری سرکاری عمارتوں کی طرف لپکے۔ ان عمارتوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ پولیس لائینز پر بھی حملے ہوئے۔ لیکن ہجوم کے حملوں سے انسانی جانوں کا ابھی تک نقصان نہیں ہوا تھا۔ مقامی جیل پر بھی حملہ کرنے کی تیاری تھی۔ مگر پولیس کی فائرنگ سے اس حملے کو روک دیا گیا۔

جب سورج چڑھ چکا تھا

صبح کی اس کارروائی کے باوجود ہجوم کو کنٹرول کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ عوام سے بار بار ٹکراؤ کی صورت میں پولیس فائرنگ کیے جا رہی تھی۔ جس کے نتیجے میں مختلف علاقوں کے ہجوم ریلوے سٹیشن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہاں انھوں نے سٹیشن کو آگ لگا دی، گودام کا مال لوٹ لیا۔ وہیں سیسن انڈسٹریل سکول کو نذرِ آتش کیا۔ چرچوں پر حملے بھی ہوئے اور انہیں جلایا گیا۔

اب انتظامیہ کو احساس ہوا کہ حالات ان کے کنٹرول سے بالکل باہر ہو چکے ہیں۔ شہر میں فوج طلب کرنے کا فیصلہ کیا گیا لیکن فوری طور پر فوج پہنچ نہیں سکتی تھی۔ قریب ترین فوجی دستے سیالکوٹ میں موجود تھے جن کے پہنچنے میں کئی گھنٹے لگ رہے تھے۔ اس لیے ایئر فورس کی مدد دی گئی۔ دوپہر کو تقریباً تین بج کر دس منٹ پر لاہور کے والٹن ایئر پورٹ سے رائل ایئر فورس کے تین ہوائی جہاز اپنے روایتی اسلحے کے ساتھ مسلح پرواز کرتے ہوئے گجرانوالہ پہنچے۔

گوجرانوالہ پر بمباری کا آغاز

تین جہازوں کے اس مشن کی قیادت اس وقت کے میجر کاربیری کر رہے تھے جو 31 سکواڈرن کے کمانڈر تھے۔ ان کا جہاز گوجرانوالہ کی حدود میں سب سے پہلے پہنچا اور انھوں نے سات سو فٹ سے لے کر صرف سو فٹ تک کی نیچی پروازیں کیں تاکہ گوجرانوالہ شہر اور اس کے ارد گرد تین میل علاقے کا فضائی جائزہ لے سکیں۔

میجر کاربیری کے مطابق، انھوں نے ریلوے سٹیشن اور اس کے گوداموں کو جلتے ہوئے دیکھا۔ سٹیشن سے باہر ایک ٹرین بھی نظر آئی جس میں آگ لگی ہوئی تھی۔ سٹیشن پر اور سٹیشن سے سول لائینز تک اس سے ملحقہ سڑکوں اور گلیوں میں لوگ ہی لوگ تھے۔ سول لائینز میں انگلش چرچ اور چار گھروں پر آگ لگی ہوئی تھی۔

بمباری کرنے والے جہازوں کے پائلٹوں کو زبانی ہدایات دی گئیں تھیں کہ وہ اگر ہجوم پر بمباری کریں تو صرف کھلے میدانوں میں کریں۔ اس کے علاوہ اگر پائلٹس شہر سے باہر کہیں کوئی ایسا ہجوم دیکھیں جو شہر کی طرف بڑھ رہا ہو تو اسے منتشر کرنے کے لیے بمباری کر سکتے ہیں۔

میجر کاربیری کے جہاز کی بمباری

میجر کاربیری نے پہلی بمباری شہر سے باہر ایک ہجوم پر کی جو ان کے بقول ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل تھا۔ یہ ایک گاؤں شہر کے شمال مغرب کی جانب تھا اور ان کی اطلاع کے مطابق اس گاؤں کا نام دُھلاّ تھا۔ ہلاکتوں کے بارے میں بعد میں مختلف قیاس آرائیاں کیں گئیں۔ بم گرانے کے بعد موقعے سے بھاگنے والے دیہاتیوں پر پچاس گولیاں مشین گن سے فائر کی گئیں۔

اس کے بعد میجر کاربیری نے شہر کے جنوب سے ایک میل کے فاصلے پر گھرجاکھ نامی گاؤں پر دو بم گرائے، بقول ان کے ایک بم پھٹا ہی نہیں تھا۔ یہ لوگ گوجرانوالہ سے لوٹ رہے تھے۔ بم گرنے کے بعد لوگ منتشر ہو گئے۔ اس ہجوم پر پھر بھی پچیس گولیاں مشین گن سے فائر کی گئیں۔ انکوائری کمیٹی کے مطابق اس بمباری سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔

خالصہ ہائی سکول پر بمباری

ان کارروائیوں کے بعد یہ جہاز گوجرانوالہ شہر کی طرف لوٹے۔ میجر کاربیری نے ایک سرخ عمارت کے قریب کھیتوں میں دو سو کے قریب لوگوں کو چھپے دیکھا۔ یہ خالصہ ہائی سکول اور اس کا ہاسٹل تھا۔ اس کے صحن میں ایک بم پھینکا گیا۔ مشین گن سے تیس کے قریب گولیوں کے فائر کیے گئے۔ انکوائری کمیٹی کو صرف ایک شخص کے ہلاک ہونے کی اطلاع بعد میں ملی۔

اس کے علاوہ شہر میں دو مزید بم گرائے گئے۔ میجر کاربیری نے کہا تھا کہ انھوں نے ان بموں کو پھٹتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس بات کی تصدیق نہیں ہوسکی۔
اس کمیٹی کی انکوائری کے مطابق میجر کاربیری نے کل ملا کر آٹھ بمب گرائے تھے اور ان میں سے دو جو شہر کے اندر گرائے تھے ان کے بارے میں انکوائری کا خیال ہے کہ ان کا ہدف عوام کے ہجوم تھے۔ میجر کاربیری نے سٹیشن کی طرف آنے والے ہجوم پر کُل ملا کر ڈیڑھ سو گولیاں فائر کیں تھیں۔

باقی دو جہازوں کی بمباری

اس کے علاوہ انکوائری کمیٹی کے مطابق دو دیگر جہاز جو لاہور سے گوجرانوالہ پر بمباری کے لیے بھیجے گئے تھے، ان میں ایک نے تو کوئی کاروائی نہیں کی البتہ دوسرے جہاز نے اپنی مشین گن سے پچیس گولیاں فائر کیں تھیں۔
انکوائری کمیٹی ان جہازوں سے پھینکے جانے والے بموں اور گولیوں کی تعداد سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے ایک اور ذریعے سے اندازہ لگایا کہ طاقت کا زیادہ استعمال ہوا تھا۔
اس وقت راولپنڈی میں تعینات سیکینڈ ڈویژن کی وارڈائری میں 14 اپریل کو شام چھ بجے ایک رپورٹ درج ہوئی تھی: رائل ایئر فورس کے لیفٹیننٹ کربی نے گوجرانوالہ میں آتشزدگی کے واقعات کی تصدیق کی اور کہا کہ انھوں نے ہنگامہ کرنے والوں پر کامیابی سے فائرنگ کی۔ اس کے بعد وہ جہاز کو وزیرآباد کے ایک میدان میں اتارنے پر مجبور ہوئے تھے۔ وہاں مظاہرین جمع ہو گئے اور ان کے جہاز پر حملہ کرنے والے تھے لیکن انھوں نے جہاز کو دوبارہ سٹارٹ کرلیا اور اسے اُڑانے میں کامیاب ہو گئے۔

ہلاکتوں کی سرکاری تعداد

ان واقعات کے بعد انتظامیہ کے اعلیٰ افسر، کرنل اوبرائین نے انکوائری کمیٹی کو بتایا تھا کہ 14 اپریل کی رائل ایئر فورس کی بمباری اور ہنگاموں سے گوجرانوالہ میں 11 افراد ہلاک ہوئے تھے جبکہ 27 زخمی ہوئے تھے۔

بمباری کا فیصلہ کس نے کیا تھا

گوجرانوالہ میں بمباری کا فیصلہ لاہور میں اس وقت کے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر، سر مائیکل اوڈوائیر نے کیا تھا۔ ان کے بقول گوجرانوالہ کے مظاہرے ان کے لیے ایک جھٹکے کی مانند تھے۔ ہمیں اس شہر سے مظاہروں کی خبر 14 اپریل کو ملی جب پورے پنجاب میں بغاوت اپنے عروج پر تھی۔ انھیں صوبے کے ہر حصے سے حملوں کی خبریں آ رہی تھیں۔ امرتسر کے قریب ایک ٹرین کو الٹ کر ہجوم نے ریل لائن سے اتار دیا تھا۔ سر مائیکل اوڈوائیر کے مطابق، گوجرانوالہ میں حالات پر قابو پانے کے لیے فوج روانہ کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے ایئر فورس کا استعمال کیا گیا۔

اگلے دن دوبارہ بمباری

15 اپریل کو ایئر فورس کا ایک اور افسر لیفٹیننٹ ڈوڈکنز کو اوپر سے حکم آیا کہ وہ گوجرانوالہ کی جانب پرواز کرے اور لاہور اور گوجرانوالہ کے درمیان ریلوے لائن کا جائزہ لے کہ آیا وہ تباہ تو نہیں ہوگئی ہے۔ اسے یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ وہ گوجرانوالہ کی تازہ ترین حالات کا بھی فضائی جائزہ لے۔ اسے کسی بھی بڑے ہجوم کے خلاف کارروائی کا بھی حکم دیا گیا تھا۔
اس افسر کو گوجرانوالہ میں تو کوئی گڑبڑ نظر نہیں آئی لیکن ایک میل باہر شہر کے مغربی علاقے میں تیس چالیس افراد نظر آئے۔ اس نے ان پر مشین گن سے فائرنگ کی۔ اس کے بعد ایک اور گاؤں میں تیس یا پچاس افراد کا ہجوم نظر آیا۔ لیفٹیننٹ ڈوڈکنز نے اس ہجوم پر ایک بمب پھینکا جو ایک گھر میں گرا اور پھٹا۔ انکوائری نے تسلیم کیا کہ ان دونوں بموں سے ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد کا کوئی علم نہیں ہوسکا۔ (بشکریہ بی بی سی اردو)

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔
ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ
تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق
اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

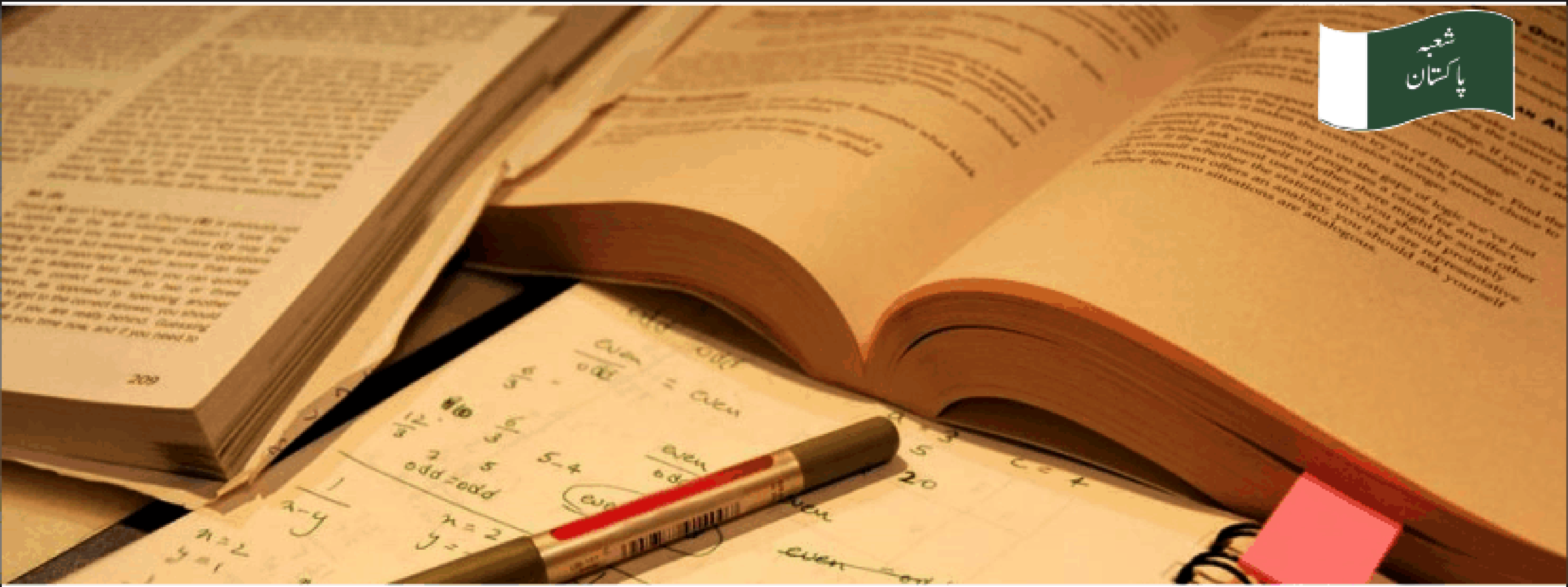

سی ایس ایس کی تیاری

تحریر: فاروق احمد انصاری

سول سروس کا امتحان پاس کرنا ہر باصلاحیت طالب علم کا خواب ہوتا ہے۔ اس امتحان میں کامیابی کیلئے وہ سخت محنت کرتے ہیں لیکن کامیابی چند ایک کے ہی قدم چومتی ہے۔فیڈرل پبلک سروس کمیشن (FPSC) کی رپورٹ کے مطابق 2016ء میں 20 ہزار 717 امیدواروں میں سے 12 ہزار 176 افراد امتحان میں شریک ہوئے اور ان میں سے صرف 379 امیدوار ہی تحریری امتحان میں کامیاب ہوئے جبکہ 2017ء میں 9391 امیدواروں میں سے 310 نے کامیابی کا مزہ چکھا۔

ان نتائج سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر آپ سول سروس کے امتحان میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو یہ بات ذہن میں رکھیں کہ آپ کو ہزاروں طلبہ سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ سول سروس کے امتحان کا اہل ہونا کوئی مشکل نہیں بشرطیکہ اگر آپ صحیح خطوط پر اس کی تیاری کریں۔ بہت سے طالبعلم تمام تر محنت ومشقت کے بعد بھی امتحان میں بیٹھنے کے اہل نہیں ہو پاتے کیونکہ ان کی تیاری صحیح نہیں ہوتی۔ وہ نہیں جانتے کہ کیا پڑھنا ہے اور کیسے تیاری کرنی ہے۔محنت ومشقت اسی وقت رنگ لاتی ہے، جب اس کی سمت درست ہو۔ اس ضمن میں سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ اس امتحان میں کامیاب ہو چکے ہیں، ان کے تجربات سے استفادہ کیا جائے۔سی ایس ایس کا امتحان دراصل آپ کے رجحان، علمی قابلیت اور مختلف میلانوں میں آپ کے پیشہ ورانہ روّیہ کو پرکھتا ہے۔آپ کا ذہن، تفہیم اور ذہانت تیزی سے کام کرتے ہوں، آپ کو حالات حاضرہ کی خوب آگہی ہو، تبھی آپ سی ایس ایس کے امتحان کیلئے کوالیفائی کرسکیں گے۔ اس کے علاوہ آپ کو اپنے مضامین پر مکمل عبور حاصل ہو، صرف کتابی علم نہیں بلکہ اس میں تخلیقیت کا عنصر بھی شامل ہو، تاکہ جب آپ امتحان میں اپنے مقالے لکھ رہے ہوں تو وہ اس بات کی توثیق کریں کہ آپ کے اندر بہت سے گُن موجود ہیں۔آیئے جانتے ہیں کہ کن مضامین پر دسترس ہونا ضروری ہے۔

انگریزی مضمون

آپ کو 10 موضوعات دیے جاتے ہیں، جن میں سے کسی ایک پر آپ کو انگریزی میں 2500 سے 3000 الفاظ کا قابل فہم وجامع مضمون لکھنا ہوتا ہے، یہی ایک مضمون ہے جس سے آپ کے مارکس زیادہ متاثر ہوسکتے ہیں۔ یہ مضمون آپ کے اسلوب، درست گرامر، تخلیقیت، خیال اور اظہار کو پرکھنے کیلئے لیا جاتا ہے۔ یاد رکھیں، مضمون عبارتوں کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جو پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہیں۔سب سے پہلے تو آپ مضمون کے خاکہ کو سمجھیں۔ اس کی بُنت کو دیکھیں، اس کا

تعارفی پیراگراف کیسا ہوگا یا پھر اختتام کیسے کریں گے کہ وہ پورے مضمون کا خلاصہ بیان کردے۔ اس ضمن میں آپ کو تحریری قابلیت، گرامر، ذخیرہ الفاظ اور محاورے وغیرہ کے صحیح استعمال کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اس کے لیے آپ سابقہ مضامین کا مطالعہ بھی کرسکتے ہیں۔

حالاتِ حاضرہ

اس پیپر کے پہلے حصے میں آپ کو 20 سوالات کے صحیح جوابات (MCQs) پر نشانات لگانے ہوتے ہیں جبکہ دوسرے حصے میں چھ میں سے چار سوالات کے جوابات تحریر کرنے ہوتے ہیں۔ اس کیلئے آپ کو روزانہ اخبارات کا مطالعہ کرنا ہوگا، ساتھ ہی ٹی وی اور ریڈیو پر خبریں سننی ہوں گی۔ تاریخی آگہی کے ساتھ ساتھ آپ کو موجودہ سماجی، ثقافتی اور مذہبی معاملات کا علم بھی ہونا چاہئے۔

جنرل سائنس

یہ بھی MCQs اور تحریری سوالات پر مشتمل پرچہ ہوتا ہے، جس میں روزمرہ کی سائنس جیسے گلوبل وارمنگ، آلودگی، گرین ہاؤس ایفیکٹ وغیرہ سے متعلق سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ سائنسی مسائل کے ساتھ ساتھ آپ کو بائیولوجی، کیمسٹری اور فزکس کے سوالات کا بھی سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ آپ نے میٹرک اور انٹر میں یہ مضامین پڑھ رکھے ہیں تو پھر آپ کیلئے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔

حالاتِ پاکستان

اس پرچہ میں پاکستان میں ہونے والی سیاسی، سماجی اور اقتصادی سرگرمیوں سے متعلق سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ اس لیے آپ کو ان تمام سرگرمیوں پر نظر رکھنی ہے۔ اس میں پڑوسی ممالک کے ساتھ تعلقات کا سوال بھی آسکتا ہے۔ آپ کو اس ضمن میں مطالعہ پاکستان کی کتابیں پڑھنے کی ضرورت ہوگی۔ آپ کو باقاعدگی سے اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

اسلامک اسٹڈیز

یہ بھی MCQs اور تحریری سوالات پر مشتمل پرچہ ہوتا ہے۔ اس کیلئے آپ کو اسلام اور اس کے اطلاق کے بارے میں معلومات ہونی چاہئیں۔ اسلامی عقائد اور اسلامی تاریخ کے موضوعات بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کیلئے آپ کو انٹر اور بیچلر کی اسلامیات کی کتاب ازبر کرلینی چاہئیں۔ آپ میں بنیادی معلومات کے ساتھ ساتھ اسلامی نقطۂ نظر سے سماجی و سیاسی منظر کو اس کے سیاق سباق کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔

اختیاری مضامین

اختیاری مضامین کی ایک طویل فہرست ہے، جس میں موضوعات کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ آپ کو اپنی تیاری اور رجحان کے مطابق ایسے مضامین کا انتخاب کرنا چاہیے، جس سے آپ بآسانی امتحان پاس کرسکیں۔ پہلے آپ دستیاب مضامین کو دیکھیں، پھر ان کے کورس کا مطالعہ کریں۔ ان میں سے جو مضمون آپ کی دلچسپی کا ہو اور اس کے بارے میں آپ کو پہلے سے اچھی خاصی آگہی ہو، اسے منتخب کرلیں۔ اس کا فیصلہ آپ کے انٹر یا بیچلر کے پسندیدہ مضامین کردیں گے۔

Lahore International Magazine
Instagram: @lahoreintl
Twitter : @lahoreintl
Facebook: lahoreinternational
YouTube: lahoreinternational
Google+: lahoreintl
Contact: +447940077825
Whatsapp: +447940077825
Email: lahoreintlondon@gmail.com

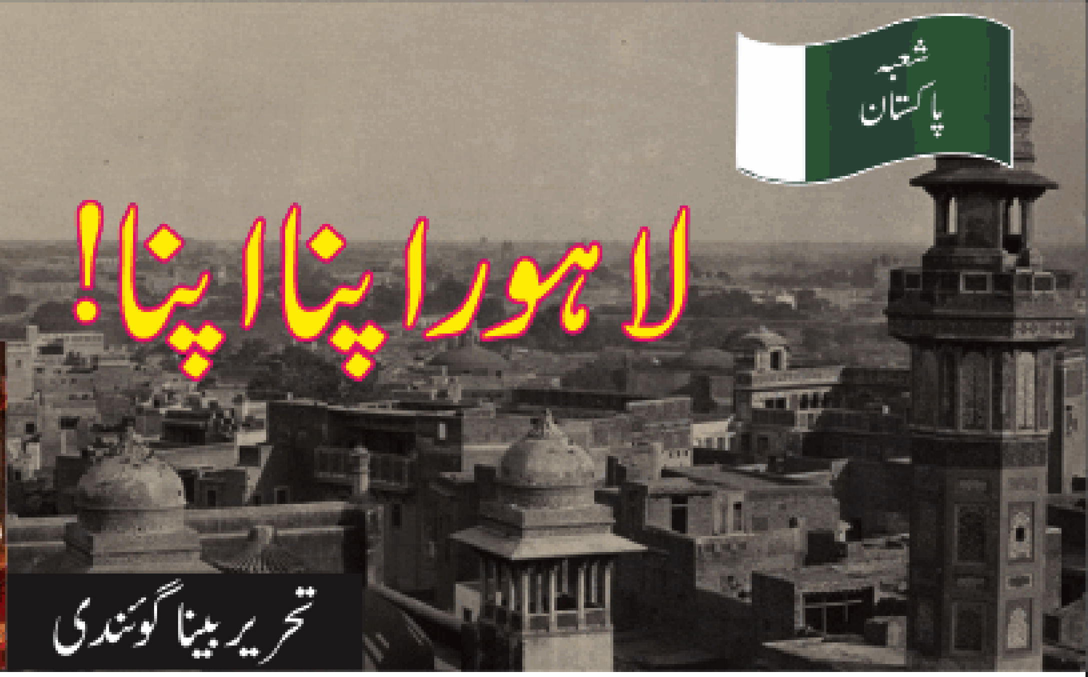

لاہور اپنا اپنا!

تحریر بینا گوئندی

زمانے بدل گئے، لوگ وقت کی قید سے باہر نکل کر زمین میں شامل ہو کر ابد میں قید ہو گئے، مگر رہ گیا ہزاروں سال پرانا شہر "لاہور"۔ انسان بھی کلاسیکی ادب کی مانند زندہ رہنا پسند کرتا ہے، وہ زندگی میں تاریخ اور مستقبل کی تصویر بناتا ہے۔ وہ اپنی فہم وفراست کو مستقبل کے آئینے میں دیکھنا پسند کرتا ہے جس کے لئے وہ اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لاتے ہوئے احتیاط اور جرات کے امتزاج سے تہذیبی یادیں چھوڑ جاتا ہے۔

سرگودھا میں ابتدائی تعلیم کے بعد میں نے اپنا شہر "لاہور" انتخاب کیا۔ آخر مجھے بھی آگے بڑھنا تھا۔ میٹرک میں امتیازی نمبر حاصل کیے تو داخلہ بھی لاہور کالج فارومن میں عزت و آرام سے ملا۔ بس اب میں بے وفائی کے دور میں داخل ہو گئی کہ "محبت لاہور" نے میرے مختصر ماضی کو پرے دھکیل کر اپنے تہذیبی اور ترقی کے حسن و جمال کے دامن میں لپیٹ لیا۔ پہلے تو گرمیوں کی چھٹیوں میں اس لاہور میں اپنی نانی کے گھر آتے تھے، مگر اب تو میں نے فتح ہی کر لیا تھا بہتے صاف شفاف راوی کے لاہور کو۔

1848 میں انگریزوں نے پورے پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس دور میں انگریزوں نے لاہور میں بے شمار تعلیمی ادارے جن میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، انجینئرنگ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، ایچیسن کالج، گورنمنٹ کالج، لاء کالج، میوسکول آف آرٹس، کنیرڈ کالج کے علاوہ بے شمار سکول قائم کیے۔ اس کے علاوہ لاہور کی چھاؤنی یعنی کینٹ جہاں میرے بڑوں اور میرا گھر رہا، وہ کینٹ بھی انگریزوں نے بنوایا۔ مال روڈ جو ہر لاہوری کا عشق رہا وہ بھی انگریز کے دور میں بنی اور اس پر موجود سیکریٹریٹ کی عمارت لارنس گارڈن، عجائب گھر، ٹولنٹن مارکیٹ، اور دیگر بڑی بڑی عمارتوں کے علاوہ لارنس لائبریری موجودہ قاعداعظم لائبریری بھی اس دور کی نشانیاں ہیں۔ لاہور کا جدید اور منفرد بنیادوں پر بنا ریلوے اسٹیشن بھی انگریزوں کے دور میں ہی بنا۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ رام کے بیٹے "لوہ" نے اس شہر کی بنیاد رکھی اور قلعہ بنوایا؛ شہر لاہور کا نام بھی اس ہی کے نام پر رکھا گیا جسے وقت کی گھڑیوں نے "لاہور" میں تبدیل کر دیا۔ مگر لاہور کی طلسماتی نگری "کرشن نگر" جہاں پاکستان کے بڑے بڑے نام پروان چڑھے جب میں بیاہ کر اپنے سسرال کے آبائی گھر میں وہاں منتقل ہوئی تو ششدر رہ گئی "میرا لاہور" اس کرشن نگر کے لاہور سے مختلف تھا۔ میرے لاہور کے ماحول میں بیگمات دن کے دس گیارہ بجے گھر گرہستی سے فارغ ہو کر لیڈیز کلب میں اکٹھی ہوتیں جہاں پر فیشن کے ساتھ ساتھ سیاست، ملکی ترقی اور زمانے کی بدلتی ہواؤں کو بھی زیر موضوع بنایا جاتا تھا۔ میری نانی بھی اس محفل باوقار میں اکثر حاضری دیا کرتی تھیں۔ اور یہ خواتین جب تنبولہ کھیلتیں تو بوجوہ حفظ مراتب جنرل اور برگیڈیر کی بیگمات کو کم کم ہار کا منہ دیکھنا پڑتا۔

آج بھی میرے اس "نئے لاہور" کی پہلی صبح کی یادوں کے منظر نامے سرفہرست ہیں۔ جہاں پر علی الصبح گلی میں پراندے اور ناڑے بیچنے والا للّی محاوراتی انداز اور دھیمے لہجے میں آواز لگا کر پاک دامن خواتین کو خریداری کا پیغام پہنچاتا۔ میرے نئے لاہور کا مسکن ایک حویلی نما گھر "جیون بھون بلڈنگ" تھا۔ جس کی تعمیر ایک امیر سکھ بھون سنگھ نے 1936 میں کروائی اور تقسیم ہند کے وقت اسے یہ گھر یعنی "اپنا لاہور" چھوڑ کر جانا پڑا۔

یہ نیا پوش علاقہ ان دنوں اندرون لاہور کی سرحد سے باہر اور ملحقہ تھا، ہندوں کی آبادی کے لعل و جوہر یہاں آباد تھے۔ جبکہ مسلمانوں کی ادھر صرف دو عمارتیں سراج بلڈنگ اور نوری بلڈنگ ہوا کرتی تھیں۔ بٹوارے کے وقت لوگ ادھر سے ادھر کیا ہوئے، تہذیبیں بھی منتقل ہو گیں۔ یہاں سے جانے والے لوگ لاہوری تہذیب کو اپنے ساتھ لے گئے اور نئے آنے والوں نے لاہور کے تہذیبی رویوں میں منفرد اضافہ کیا۔ "نیلی بار" پہلے جہاں پر دنیا کی بہترین شرابیں دستیاب تھیں پھر وہاں پر ادیبوں کے ڈیرے اور مشاعرہ بازی کی فضا میں کلاسیکی ادب کی تسطیر نفس کا سماں بننے لگا۔

صوفی تبسم، اشفاق احمد، منو بھائی، روحی کنجاہی، کامران اور کشور ناہید سمیت بے شمار ادیب اس علاقے میں آ کر بسے اور احساس فخر میں ہی ڈوبے رہتے تھے۔ میرزا ادیب کا گھر وہیں پاؤنڈ وسٹریٹ پر اس علاقے کا آخری مکان تھا، اس سے آگے ہرے بھرے کھیت ہی ہوا کرتے تھے اور جب حاجی نتھے خان داتا دربار کی مسجد میں روزانہ فجر کی اذان دیتا تو اس کی آواز کرشن نگر کے ہر گھر میں گونجتی تھی۔

داتا کی نگری کا لاہور جہاں پر لوگ بے سروسامان آتے ہیں اور امیر ترین ہو

جاتے ہیں۔ درویشوں، صوفیوں اور حضرت میاں میر صاحب کا لاہور جہاں پر اہل تیقن کو اندیشوں سے آزادی اور دشمنوں سے نجات مل جاتی ہے۔ یہاں بے گھر لوگوں کو فٹ پاتھوں اور باغوں میں میں سونے پر منع نہیں کیا جاتا تھا، یعنی لاہور امیر اور غریب سب کو پناہ دیتا ہے۔ مہمان نوازی، وضع داری اور رشتہ داریوں کو نبھانا مقامی لاہوریوں کے مزاج کا اہم خاصہ ہے۔ نارووال کے آخری اسٹیشن سے لے کر نوشکی کے برفاب پانیوں کی جھلک لاہور میں ملتی ہے۔

حفیظ جالندھری کی قبر مینار پاکستان کے احاطے میں اور علامہ اقبال کی تدفین قلعہ اور بادشاہی مسجد کے درمیانی علاقے میں ہونا لاہور کے فہم و فکر، ثقافت کے ساتھ ساتھ اہل دانش کے احترام کی دلیل ہے۔ ہمارے پیارے دوست واصف علی وصف کا دربار میانی صاحب قبرستان میں بنا اور مریدوں کا ہجوم اس شہر کے احسانوں کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔

لاہور میرے لئے ایک محبوب سے کم نا رہا، ایک عرصہ ملک سے باہر رہی، دل کو چیرتا تھا تو لاہور کی محبت کا تیر جو قلم کی کمان سے نکل کر مجھ سے "شہرِ بے وفا" لکھوا گیا۔ لاہور سے دور ہوئی تو گویا زندگی کے تصور سے محروم ہوئی، اس بے بسی کے دور میں کسی آرزوئے سرگرداں میں نا رہی۔ پس عالم تحیر میں بیٹھے بیٹھے وہاں سے لاہور کے فاصلوں کو ناپتی رہی اور پھر ایک دن شہنشاہ دل کی سواری کی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شہر دلربا میں دوبارہ آ بسی۔

اب تو مجھ پر لاہور کی برکتوں کا ایک عالم برپا ہونا شروع ہوا۔ ہر طرف سے رجوع نور کی بارش برسنے لگی۔ میری مجبوری میں ڈوبی صلاحیتوں کا ستارہ چمکنے لگا دمکنے لگا۔ دن رات بنا کوشش کیے بغیر کانفرنسوں، مشاعروں اور مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچرز کا ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میرے رفقا اور دوست احباب کیا، کبھی کبھی میرے لئے بھی یہ غیر معمولی پذیرائی سمجھ سے باہر ہو جاتی۔ ایسے میں اپنے غیر ہونے لگے۔

مگر یہ سب کیسے ممکن ہوا، چشم بینا تو بے نور ہو کر پہچان سے کوسوں دور مٹی میں اَٹی پڑی تھی۔ ہر عام و خاص نے مجھ پر نظر کڑی رکھنی شروع کر دی اور میں نے بھی اپنے آپ کو غرور وفنا کے دیس سے تھا آزاد کر لیا اور دل میں شہر لاہور کی محبت کو آباد کر لیا۔ خیال میں وجدان کی طاقت مضبوط سے مضبوط تر ہونے لگی۔ خیال کے آتے ہی بلاوا ای میل میں تیار پڑا ہوتا تھا۔

ارے یہ کیا خیبر پختونخوا کی صوابی یونیورسٹی سے پروفیسر محمد رحمان نے پہلا یادگاری مشاعرے کا پرزور بلاوا دیا۔ پھر تو پروفیسر زینی بھی اس اصرار میں شامل ہو گیں۔

میں ڈر گئی کہ خیبر پختونخوا والوں کو کس نے اطلاع دی کہ بینا گوئندی واپس پاکستان آ چکی ہیں، میری تو راتوں کی نیند ہی اڑ گئی۔ مصدقہ حقیقت ہے کہ جب ایک دوسرے میں فاصلے ہوں تو خوف کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہ فاصلے میلوں کی مسافتوں کے علاوہ طبقاتی فاصلے بھی ہوتے ہیں۔ ہم قریبی رشتوں کو بھی چھوڑ دیتے ہیں کہ ہمارا ان کا ذہنی فرق ہے، ایک گھر میں پلنے والوں کو جب ایک دوسرے کے دکھوں کا احساس نا ہو تو وہ کچھ مانگ نا لے کا خوف پیدا ہو جاتا ہے۔

میں نے دو چار معززین سے دریافت کیا کہ صوابی یونیورسٹی میں جانا کیا ایک اچھا تجربہ ہوگا، مگر یقین کریں ان پروگریسو لوگوں نے بھی مطمئن جواب نا دیا۔ بس میں نے صوابی والوں سے کہا کہ میرے ساتھ میرا ایک شاعر ساتھی بھی ہوگا۔ ان اللہ کے نیک لوگوں نے میری اس فرمائش کو پورا کیا اور یوں میں اور شاہد رضا لاہور سے صوابی کے لئے روانہ ہوئے۔ وعدے کے مطابق یونیورسٹی کے پروفیسروں کا ایک قافلہ اسلام آباد پشاور موٹروے کے صوابی انٹرچینج پر گاڑیاں لے کر ہمارے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔

اس قافلے کے روح رواں پروفیسر جناب ڈاکٹر محمد رحمان صاحب اور ان کے

ساتھی پروفیسر ڈاکٹر سبحان تو جو خوش تھے وہ تھے۔مگر میرے روبرو تو ایسے لگتا جیسے دو فرشتے تھے اور مجھے اپنی سوچ اور خوف پر بے حد ندامت ہوئی۔آج تک میں نے صوابی کے حوالے سے ایک ہی نام سابق صدر پاکستان غلام اسحاق خان کا ہی سنا ہوا تھا۔گاڑی میں سفر جاری تھا دونوں اطراف سبزہ ہی سبزہ تھا، اپنا علاقہ دکھاتے دکھاتے بیس منٹوں میں ایک کچی پکی آبادی میں ہماری گاڑی داخل ہوئی اور چند منٹوں بعد انہوں نے گاڑی روک کر اترنے کو کہا اور بولے" ویلکم ٹو لاہور میڈم" میں نے کہا جی میں لاہور سے آئی ہوں مگر وہ بولے میڈم" آپ ابھی بھی لاہور میں ہی ہیں، مگر یہ صوابی کا لاہور ہے، سکندر اعظم کا لاہور ہے، راجہ انند پال کا لاہور ہے" اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتے میں نے بڑھ کر کہا" اور اب یہ بینا گوئندی کا لاہور بھی ہے،" لاہور کے مقدر میں فتح ہونا لکھا ہے گویا آج میں نے ایک اور لاہور فتح کر لیا۔

دریافتوں کا یہ سلسلہ سانس کی ڈوری کے ساتھ جڑا ہے مگر ہم عجلت بازی میں منزلوں کو راستے میں چھوڑ آتے ہیں۔میں اپنی منزل پر پہنچ چکی تھی، میرا گائیڈ میرے خیال کا خالق اور میرے وجود کا مالک ہے۔مگر میں ہمیشہ رک کر اس کی بات سنتی ہوں، کبھی کبھی لوگ میری اس ادا کو پسند نہیں کرتے مگر میں امتحان میں شکست قبول کرنے کی بجائے اس کو دوبارہ دینا سمجھتی ہوں۔اب تو ڈاکٹر محمد رحمان نے ایک منی لیکچر دینا شروع کیا"صوابی خیبر پختونخوا کا گنجان آباد ضلع ہے۔

اس کے شمال میں مردان، مشرق میں ہری پور، مغرب میں نوشہرہ اور جنوبی حصہ میں دریائے سندھ کے ذریعے یہ پنجاب سے ملحق ہے۔پختونوں کی بہادر قوم یوسفزئی قوم کے بڑے بڑے سردار یہیں پیدا ہوئے۔جن میں گجو خان، ملک احمد خان اور ملک شاہ منسور شامل ہیں۔یہ ضلع ابتدا میں پشاور اور بعد میں ضلع مردان کا حصہ رہا۔پھر 1986ء میں الگ ضلع بن گیا۔اس میں تین یونورسٹیاں ہیں جس سے اس کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔اس یونیورسٹی آف صوابی کا سنگ بنیاد 27 نومبر 2012ء میں اے این پی دور میں وزیر اعلی 'امیر حیدر خان ہوتی نے رکھا۔

اس یونیورسٹی کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ یہ اسلام آباد پشاور موٹروے پر صوابی انٹر چینج کے سنگم پر واقع ہے۔اس کی پہلی وائس چانسلر ڈاکٹر نور جہاں تھی۔موجودہ وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر امتیاز علی خان نے 2017ء میں چارج لیا۔ان کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔امتیاز علی خان اس یونیورسٹی کو بہت آگے لے گئے۔اب تک ان کی سربراہی میں اس یونیورسٹی میں 15 نئے تدریسی شعبے قائم ہو چکے ہیں اور مزید شعبوں کے حوالے سے بھی کام جاری ہے۔

یونیورسٹی کا نیا کیمپس بھی اسی وائس چانسلر کا کارنامہ ہے۔" میں ان کی اس گفتگو کو سن رہی تھی مگر ان کچے پکے مکانوں اونچی نیچی سڑکوں اور ٹیلہ نما چوراہوں میں سکندر اعظم کو گھومتے دیکھ رہی تھی، جب وہ اس علاقے ہنڈ سے گزر کر ایشیا گیا اور راجہ پورس کو شکست دی۔اس کے بعد یہاں پر محمود غزنوی آیا، اور اس نے اس پر قبضہ کر لیا۔لاہور کی گلیوں میں بچے کم نظر آرہے تھے مکانوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی بے شمار محلے کی مساجد تھیں۔

ایک قدرے بڑے مگر کچے گھر کی طرف اشارہ کر کے ڈاکٹر صاحب کہنے لگے یہ اس علاقے کا امیر ترین شخص ہے مگر یہ بھی باقی تمام لوگوں کی طرح ہی مل جل کر رہتا ہے۔وہ کہنے لگے لاہور آج کل ایک تحصیل بھی ہے اور یہ علاقہ سنسکرت زبان کی گرائمر بنانے والے شخص پانینی کی جائے پیدائش بھی ہے۔اس لاہور کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ہے۔اس کے تمام آثار اور نوادرات ہنڈ کے عجائب گھر میں موجود ہیں۔

بات آگے مزید بڑھتی میرے دل میں یہ ہی خیال آیا کہ آج کے سکندر اعظم اور پانینی کوئی اور نہیں آپ ہیں۔

جنھوں نے اردو کے شعبے کے قیام کے لئے اس یونیورسٹی میں دن رات محنت کی اور اس کو بنانے میں کامیاب ہوئے اور یوں یہاں پر آج 18 فروری 2019 کو پہلا اردو کا جشن بہاراں مشاعرہ کروایا۔

کھانے کے بعد یونیورسٹی کی مختلف پروفیسروں سے ان کے ہوسٹل میں تفصیلی ملاقات ہوئی اور پاکستان کے اس علاقے کی عورت جو صرف اپنے رہن سہن اور پہناووں کے علاوہ اپنے نظام فکر میں بھی دنیا کی باقی خواتین کے برابر نہیں آگے ہیں۔

اگلے روز مشاعرے کے لئے یونیورسٹی کا ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور مقررہ وقت کے مطابق کسی دیر سے آنے والے کا انتظار کیے بغیر مشاعرہ شروع ہو گیا۔عباس تابش، ناصر علی سید، کلثوم زیب، شاہد رضا، ڈاکٹر سہیل احمد، جاوید احمد شفیق، ڈاکٹر نذیر تبسم، ڈاکٹر سبحان ڈاکٹر واجد علی، ڈاکٹر محمد رحمان نے خوب داد سمیٹی، مگر اس وقت اہالیان لاہور نے مجھ سے بے پناہ محبت کا ثبوت پیش کر دیا جب میں اپنا کلام پڑھ کر جانے لگی تو پورے ہال نے کھڑے ہو دو منٹ تک تالیاں بجا کر ثابت کر دیا کہ چشم بینا کی گرد کو صاف کرنے کے لئے کوی فارمولا نہیں اس کی رحمت اور فضل چاہیے۔

جانے کہاں گے وہ دن!!!

لاہور انٹرنیشنل ڈیسک

دس روپے کی برف۔ پانی سے بھرا واٹر کولر۔ وی سی آر۔ وی سی پی۔ گھوڑے کی ٹاپ۔ فجر کے وقت گلی میں سے گزرتے کسی بابے کے درود شریف پڑھنے کی آواز۔ روشن دان۔ ہینڈ پمپ۔ قلم دوات۔ ہولڈر۔ جی کی نب۔۔ تختی۔ گاچی۔ بستہ۔ چھٹیوں کا کام۔ لکیروں والا دستہ۔ دستے پر اخبار چڑھانا۔ مارکر۔ حاشیہ۔ خوشخطی۔ رف کاپی۔ رف عمل۔ سلیٹ۔ سلیٹی۔ کریم کی خالی شیشیاں بھرنے والا۔ گلیوں میں چارپائیاں۔ لکن میٹی۔ چور سپاہی۔ اڈا کھڈا۔ شٹاپو۔ باندر کلا۔ کوکلا چھپاکی۔ یسو پنجو' چڑی اُڑی کان اُڑا۔ صراحی۔ چائے کی پیالیاں۔ سیڑھیوں کے نیچے باورچی خانہ۔ بتیوں والا چولہا۔ ٹارزن۔ عمرو عیار۔ زنبیل۔ افراسیاب۔ چھتری اور سائیکل کا ٹائر۔ دکان دار سے چونگا۔ نیاز بٹنا اور آواز آنا میرے بھائی کا بھی حصہ دے دیں۔''

مرونڈا۔ ٹچک۔ سوکھا دودھ۔ ڈیکو مکھن ٹافی۔ لچھے۔ ون ٹین کا کیمرہ۔ مائی کا تنور۔ کوئلوں والی استری۔ ہمسائے کے ٹیلی فون کا پی پی نمبر۔ گولی والی بوتل۔ جمعرات کی آدھی چھٹی۔ ٹوریل گروپ۔ بزمِ ادب۔ ششماہی امتحانات۔ پراگریس رپورٹ۔ عرس کے میلے میں دھمال ڈالتا سائیں۔ ٹیڈی پیسہ۔ چونّی۔ بارہ آنے۔ پُتلی تماشا۔ گراری والا چاقو۔ سیمنٹ کی ٹینکی۔ شام کے وقت گلی میں پائپ سے پانی کا چھڑکاؤ۔ دروازے کی کنڈی۔ دیسی تالا۔ ہاون دستہ۔ دادی کی کہانیاں۔ اُڑن کھٹولے کے خواب۔ ڈھیلی جرابوں کے اوپر ربڑ چڑھانا۔ لوہے کی بالٹی۔ جست کے برتن۔ بھانڈے قلعی کرالو۔ بندر کا تماشا۔ بچے کی پیدائش پر خواجہ سراؤں کا رقص۔ گلی میں پکتی دیگ۔ چھت کی نیند۔ تاروں بھرا آسمان۔ دوپٹے کے پلو میں بندھے پیسے۔ انٹینا۔ چھت پر مٹی کا لیپ۔ شہتیر۔ بالے۔ پھونکنی۔ تندوری۔ چڑیوں کا آلنا۔ مسہری۔ شوخ رنگوں کے پائے والا پلنگ۔ بان کی چارپائی۔ کھرا۔ نالی۔ پلاسٹک کی ٹونٹی۔ کپڑے دھونے والا ڈنڈا۔ مسی روٹی۔ پنجیری۔ پنّیاں۔ بالوشاہی۔ دو ٹیوٹر والا ڈیک۔ دستر خوان۔ صبح کا مشترکہ ناشتہ۔ رات کا مشترکہ کھانا۔ دانتوں پر ملنے والا منجن۔ سٹیل کے گلاس۔ سٹیل کی پلیٹیں۔ سٹیل کے جگ۔ موڑھے۔ سائیکل کی قینچی۔ سیلاب کا خوف۔ ماں کی آغوش۔ باپ کا ڈر۔ دھوتی۔ سلوکا۔ مشترکہ بیڈروم۔ اینٹوں والا فرش۔ بیٹھک۔ اُستادوں کی مار۔ مولا بخش۔ کاربن پیپر۔ سوجی کی مٹھائی۔ ڈیمو کے لڑنے پر تالا رگڑنا۔ ڈیمو کے ساتھ دھاگا باندھ کر اڑانا۔

دو غباروں کے درمیان ڈوری باندھ کر واکی ٹاکی' بنانا۔ پانی سے بھری بالٹی میں اُلٹا گلاس ڈال کر بلبلے نکالنا۔ صابن سے سر دھونا۔ سر درد کے لیے مولوی صاحب سے دم کروانا۔ بوتل کے سٹرا کو پائپ کہنا۔ آدھی رات کو ڈراؤنے قصے سننا۔ بچی کھچی روٹیوں کے ٹکڑے کباڑیے کو بیچ دینا۔ مقدس عبارت والے اوراق چوم کر کسی دیوار کی درز میں پھنسا دینا۔ بیلٹ کے بغیر پینٹ پہننا اور محلے داروں سے شرماتے پھرنا۔ کنڈلوں والے بال۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑے بڑے قہقہے۔ سکول جاتے ہوئے بس کی چھت پر پڑے ٹائر میں بیٹھ کر سفر کرنا۔ گلابی رنگ کا سٹوڈنٹ کارڈ جیب میں رکھنا۔ کڑھائی والا رومال۔ خوش آمدید والے تکیے۔ ہاتھوں سے گھولی ہوئی مہندی۔ رنگین آنچلوں کی خوشبو۔ بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کرنے کا فیشن۔ سُرمے کی لکیر خوبصورتی کی علامت۔

پسینے بھری قمیص اتار کر چلتے ہوئے پیڈسٹل فین پر ڈال دینا۔ فیوز بلب کو ہلا کر اُس کی تار پھر سے جوڑ دینا۔ بجلی کے میٹر گھروں کے اندر۔ بجلی کا سانپ کی طرح لمبا بل آنا۔ سینماؤں کے پوسٹر پر نظریں جم جانا۔ سائیکل روک کر مجمع باز کی گفتگو سننا۔ صاف کپڑوں کے ساتھ جیب میں صاف رومال بھی رکھنا۔ قمیص کی جیب میں پین لٹکانا۔ بٹوے میں چھوٹی سی ٹیلی فون ڈائری رکھنا جس میں A سے Z تک سے شروع ہونے والے ناموں کے الگ خانے ہوتے تھے۔ کسی پرانے سال کی ڈائری میں اقوال زریں' نعتیں اور اشعار لکھنا۔ ٹی وی کے اوپر خوبصورت غلاف چڑھائے رکھنا۔ کسی کے تالا لگے ٹیلی فون کے کریڈل سے ٹک ٹک کر کے کال ملانے کی کوشش کرنا۔

باراتوں پر سکے لوٹنا۔ دولہا کا منہ پر رومال رکھنا۔ دلہن کا دوسرے شہر سے بارات کے ساتھ بس میں آتے ہوئے راستے میں دل خراب ہو جانا۔ سردیوں میں اُبلے ہوئے ایک انڈے کو بھی پورا مزا لے کر کھانا۔ محلے میں کسی کی وفات پر تدفین تک ساتھ رہنا۔ مسجد کے مولوی صاحب کے لیے گھر میں الگ سے سالن رکھنا۔ ٹی وی ڈرامے میں کسی المناک منظر پر خود بھی رو پڑنا۔ فلم دیکھتے ہوئے ہیرو کی کامیابی کے لیے صدق دِل سے دُعا کرنا۔ لڑائی میں گالی دے کر بھاگ جانا۔ بارش میں ایک دوسرے پر گلی کے پانی سے چھینٹے اڑانا۔ سونے سے پہلے تین دفعہ آیت الکرسی پڑھ کر چاروں کونوں میں پھونک مارنا۔

مہمانوں کی آمد پر خصوصی اہتمام کرنا اور محلے والوں کا خصوصی طور پر کہنا کہ مہمان نوں ساڈے ول وی لے کے آنا''۔ بسنت کے دنوں میں چھت پر ڈور لگانا' مانجھا لگانا۔ بازار سے پنے' گچھے اور چرخیاں خریدنا۔ گڈیاں لوٹنا' ڈوریں اکٹھی کرنا۔ چارپائی پر بیٹھ کر ٹوٹا ہوا شیشہ سامنے رکھ کر چہرے پر صابن لگا کر شیو کرنا۔ سلیٹ ہمیشہ تھوک سے صاف کرنا۔ محلے کے بڑے بوڑھوں سے اکثر مار کھانا اور بھول جانا۔ پنکج ادھاس کی غزلیں یاد کرنا اور میکدہ' کے لفظ سے ناآشنائی کے باعث گاتے پھرنا ایک طرف اُس کا گھر' ایک طرف میں گدھا''۔ اگر آپ کو یہ سب یاد ہے تو آپ خوش قسمت ہیں کہ آئی ٹی انقلاب سے پہلے والی زندگی انجوائے کر آئے۔ اِن میں سے شاید ہی کوئی چیز باقی بچی ہو اور اگر ہو گی بھی تو شاید ویسی نہیں رہی ہو گی۔ زندگی کی نہر کے بہتے پانیوں میں سے ایک دفعہ ہاتھ نکال لیں تو وہ ویسے کب رہتے ہیں! ایسی بھی تھی زندگی!

پھوٹی کوڑی

تحریر: مجید شیخ، ترجمہ: عاصم جمالی (جھنگ)

بہت سے الفاظ جنہیں ہم یہ سوچے بغیر بولتے ہیں کہ ان کا دراصل مطلب کیا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں نے اپنی دادی سے پیسے مانگے تو انہوں نے تُرت جواب دیا۔ ''میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں'' جس کا مطلب تھا میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔

ہم سب کو معلوم ہے کہ اُن کا مطلب کیا تھا۔ اگلے ہی دن میرے دوست سیف اللہ خالد نے لاہور کے پرانے سکول کی ایک فوٹو بھیجی۔ جبکہ وہاں پھوٹی کوڑی بھی تھی۔ دنیا کا پُرانا ترین سکہ یہی ''پھوٹی کوڑی'' ہے۔ میں نے بہت سی کتابوں میں دیکھا کہ کوڑی یا پھٹا ہوا گھونگھا ہے۔ جسے ''کوڑی'' گھونگھے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کا استعمال ہماری دھرتی میں کوئی پانچ ہزار (5000) سال قبل وادی سندھ کی تہذیب میں برتا گیا تھا۔ ''پھوٹی'' کا نام اسے اس لئے دیا گیا کیونکہ اس کی ایک طرف پھٹی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لیے کوڑی کا گھونگا ''پھوٹی کوڑی'' کہلایا۔ قدرتی طور پر گھونگھوں کی پیداوار محدود تھی۔ اس کی کمیابی سے یہ مطلب لیا گیا کہ اس کی کوئی قدر رویلیو ہے۔

تین پھوٹی کوڑیوں کے گھونگھے ایک پوری کوڑی کے برابر تھے۔ جو ایک چھوٹا سا سمندری گھونگھا تھا۔ لیکن ان دونوں کی کوئی آخری حیثیت رویلیو تھی۔ وہ ''روپا'' تھی۔ جسے بعد میں ''روپیہ'' کہا جانے لگا۔ اس لفظ کا پہلا استعمال ہمیں صوابی میں چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہونے والے ماہر لسانیات پننی کی کتاب Astadyayi میں ملتا ہے۔ ایک ''روپیہ'' 5,275 ''پھوٹی کوڑیوں'' کے برابر تھا۔ ان کے درمیان دس مختلف سکے تھے۔ جنہیں ''کوڑی''، ''دمڑی''، ''پائی''، ''دھیلا''، ''پیسہ''، ''ٹکہ''، ''آنہ''، ''دونی''، ''چونی''، ''اٹھنی'' اور پھر کہیں جا کر ''روپیہ'' بنتا تھا۔

بالفرض آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سب تو پرانا مال ہے۔ تو ذرا لاہور کے عجائب گھر میں جا کر دیکھیں۔ آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ان تمام کو ایک فریم میں رکھا گیا ہے اور ان کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اس کے لئے کسی لاہور کے پُرانے دیواروں ''Walled City'' کے اندر والے باسی سے پوچھیں۔ اسے ان تمام دسیوں سکوں کا نام کی حد تک علم ہو گا۔ لیکن پہلے ''روپیہ'' کی شرح مبادلہ رمالیت کا اندازہ لگائیں کہ اس کا ''ایک تولہ'' سونا آتا تھا۔ جو کوئی 2000 سال قبل کی بات ہے۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ سونے کی مالیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہ مالیت گرتی گئی۔ حیرانی کی بات ہے کہ برصغیر میں چاندی کی مالیت سونے سے زیادہ تھی۔ کیونکہ سونے کی رسم زیادہ تھی۔ ایک بار یونانیوں کے حملے کے بعد ایران سے بہت مقدار میں چاندی یہاں آئی، تو سونے نے چاندی کی جگہ لے لی۔ لیکن روپیہ کی حیثیت کبھی بھی تبدیل نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ آج بھی تمام رقوم رکرنسی کی پشت پر سونے کی مالیت ہی پائی جاتی ہے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ یہ بتایا جائے کہ جب یہ کالم (Daily Dawn Lahore - "Harking Back" 28.04.2019) لکھا جا رہا ہے۔ تو 70,000 روپے کا ایک تولہ سونا ہے۔

میری تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ کاروبار آن لائن یا نیلامی کے ذریعے جاری ہے۔ جنہیں پنجاب کے سکوں کے بدلے میں کیا جاتا ہے۔ مجھے یہ جان کے بڑی حیرانی ردکھ ہوا کہ پُرانی دونی فرینکفرٹ میں 12 لاکھ امریکی ڈالر کی بکتی ہے۔ لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب اس کی تصدیق ''کاربن ڈیٹنگ'' کے ذریعے ماہرین کریں۔ ایک آن لائن سکوں کا تاجر 1923ء کی ''چونی'' کو امریکی ڈالر مالیتی دس ہزار ($10,000) پر فروخت کر رہا تھا۔

2400 سال قبل پنجاب کے پُرانے مسکوکات (سکے) جو لاہور کے بازاروں میں گردش میں تھے۔ انہیں پیتل سے بنایا جاتا تھا۔ جن پر ہندو دیویوں کی تصاویر ہوتی تھیں۔ جس طرح (حضرت) بدھ کی تصاویر بدھ ازم کے زمانے میں بنائی جاتی تھیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر ایک حکمران کی خواہش تھی وہ تاریخ پر اپنے نشانات چھوڑ جائے۔ جیسے کہ برطانوی عہد میں بھی کیا گیا۔ سکھوں کے عہد میں سکوں پر

رنجیت سنگھ کی محبوب زوجہ ثانی موراں کا نام سکوں پر لکھا گیا۔جنہیں اُس وقت بھی اور اب بھی ''موراں دا سکہ'' کہا جاتا ہے۔ وہ مسکوکات جن پر موراں کا نام لکھا ہے اُن کی سکے جمع کرنے والوں سے بھاری رقوم مل جاتی ہیں۔

عہد موریہ 300 صدی قبل مسیح میں، پہلی بار ٹکسال میں ڈھالا گیا۔

جب سکندر ہماری سرزمین میں آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سونا کس بہتات سے یہاں پایا جاتا ہے۔تب پہلے مختوم (جن پر مہریں ہوتی ہیں) سکے پہلے سے بازار میں گردش کرتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہڑپہ کے کھنڈرات کی کھدائی کے دوران سکوں کی ایک بہت بڑی مقدار دریافت ہوئی تھی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ترک اور مغل حملہ آوروں نے اُنہی سکوں کو معیاری شکل دی۔ بعد میں برطانوی حکمرانوں نے مسکوکات کو وہ رواج دیا، جو آج بھی چل رہا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ موجودہ لغات میں انہی پرانے الفاظ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ میری دادی نے ''پھوٹی کوڑی'' کا لفظ بولا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہی لفظ آج بھی عام بول چال کا حصہ ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ جب سکندر بھیرہ کے ''پورو'' جواب پورس کہا جاتا ہے سے ملا تھا۔تو سکے یونانی مہروں سے جلد گردش میں آ گئے۔ جن پر یونانی زبان کندہ کی جاتی تھی۔ سیالکوٹ کا یونانی (جنرل) مینینڈر Menander پہلا حکمران تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب سیالکوٹ کو سکالا Sakala کہا جاتا تھا۔تب سکندر نے لاہور سے پہلوتہی کی اور سیالکوٹ پہنچ کر اسے ملیامیٹ کر دیا۔ آگے چڑھائی کرتے ہوئے اسے دریائے ستلج پر برصغیر کی چھ افواج کا سامنا ہوا۔ جن میں نمایاں لاہور کے پورس کی فوج تھی۔ جب اس کی فوج نے بغاوت کر دی تو وہ میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ اس کی فوج کا جرنیل مینینڈر Menander تھا جس نے پہلی انڈو۔یونانی Indo-Yonani حکومت کے دارالخلافہ سیالکوٹ کی بنیاد رکھی۔ اس کے نام کے سکے پنجاب کے بازاروں میں 500 سال سے زیادہ عرصہ تک چلتے رہے۔

لاہور اور پنجاب کے بازاروں میں سونے کے سکے جن پر مینینڈر کے بعد والے یونانی حکمران Philoxenus Anicetus کی تصویر تھی، تمام علاقوں میں رائج تھے۔ پہلے چاندی کے سکے یونانی Niacis کے ساتھ آئے تھے۔ جیسا کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے وہ ایک چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ یہ بڑی دلچسپی کی بات ہے کہ یونانی فوج کے حکمران 450 سالوں تک بدھ مت سے تعلق رکھنے والے تھے۔ جیسا کہ لاہور جس میں یونانی سکے چلتے تھے ایک بدھ مت کے ماننے والوں کا شہر تھا۔

اب ہم ان یونانی سکوں کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ البتہ یہ سکے لاہور کے عجائب گھر یا برطانیہ کے عجائب گھروں یا دیگر یورپی عجائب گھروں میں محفوظ چلے آتے ہیں۔ یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ ہمارے اپنے سکے جو 4000 سال قبل کے ہڑپہ سے تعلق رکھتے ہیں اب بھی عام آدمی کو بہتر طور پر معلوم ہیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح ہم سب میں اپنی تاریخ اور زبان تقریباً تشبیہی رنگ میں ہمارے پیدائشی وجود Genes کا حصہ ہے۔

ذاتی حیثیت میں بات کروں تو جب ہم پانچوں بھائی سکول جاتے تھے تو روزانہ ہمیں چار آنے ملتے تھے۔ جو ایک چونی کے برابر تھے۔ یہ اس مقصد کے لیے ہوتے تھے کہ ہم میں سے ہر ایک ٹھنڈے مشروب کی بوتل پی سکے۔ (بوتل جس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ ملا کر بلبلے بنائے جاتے تھے) اور ہر ایک خستہ آلوؤں کا پیکٹ لے سکے۔ جنہیں کاغذ کے پیکٹ میں بند کیا گیا ہوتا تھا۔ میرا بڑا بھائی عموماً تانبے کی ایک ''پائی'' بچا لیتا تھا۔ (موراں والا پیسہ، ناقل) جس میں ایک سوراخ ہوتا تھا۔ یہ کالم افراط زر کے بارے میں نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے سکوں کی تاریخ اور نقدی کے بارے میں ہے کہ کس طرح یہ ہمارے ورثہ کا حصہ ہیں۔

یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ مستقبل میں ہماری کرنسی پر ہمارے ورثے کے نشانات ہوں گے۔ یہ ہمارے اصل قدیم ورثے پر جو مسکوکات کی تاریخ ہڑپہ اور وادی سندھ کی تاریخ پر بنیاد رکھے گی۔ 12000 سال پرانے مہرگڑھ کے مقام سے نکلنے والے سکے ہمارے سکوں پر اثر انداز ہوں گے۔ جو دنیا کی قدیم ترین علامات ہوں گے۔ ایسی کوششیں ایک چھوٹا سا قدم، اس سمت میں ہوں گی۔ جس موقف پر ہم بضد ہیں اور جن پہلوؤں کو ہم اپنی تاریخ قرار دیتے ہیں۔

لاہور رسالہ میں تمام لکھاری خواتین و حضرات کے اپنے خیالات وجذبات ہیں۔ ادارہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ سب قوم پرست اور تعصبی ہیں

(تحریر: انور مقصود)

ہم ہندوستان میں غربت اور خوف کی زندگی گزارتے تھے۔ پاکستان بنا تو یہاں پر آئے۔ جب ہم یہاں پہنچے تو ہمارے تن پر کپڑے، پاؤں میں چپل اور پیٹ میں روٹی نہیں تھی۔ یہاں کے لوگوں نے یہ سب کچھ فوراً ہمیں دیا۔ ہم نے یہاں پہنچ کر جائیداد کے جھوٹے کلیم داخل کروائے اور پھر سندھ کے تمام بڑے شہروں میں گھر، دکان، مکان، زمین اور کاروبار حاصل کیئے۔ جو پڑھے لکھے مہاجرین تھے ان کو بہت ساری نوکریاں بھی ملیں۔ یہاں کے لوگوں نے ہمیں اپنے سینے سے لگایا اپنے بند پڑے ہوئے اضافی گھر و کاروبار ہمارے حوالے کیئے۔ اس طرح قربانی کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ یہاں کے لوگ اہل بیت کی شان اور محبت میں بھی بہت ہی آگے تھے، ہم نے اس بات کا بھی فائدہ اٹھایا اور زیادہ تر جعلی سید بن گئے۔ پھر تو جیسے ہماری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔ ہمیں صرف اردو اور اپنی اپنی مادری زبان بولنا آتی تھی مگر یہاں کے لوگوں نے ہمیں سندھی زبان سیکھنے پر کبھی بھی مجبور نہیں کیا بلکہ سارے سندھی اردو زبان بولنا سیکھ گئے۔ مگر ہمیں آج بھی سندھی زبان سمجھ میں نہیں آتی۔ بلکہ ہم تو اس سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ ہماری سب سے بڑی سیاست یہ ہے کہ ہم ستر سالوں سے مہاجرین اور پاکستانی نہیں بنے مگر مقامی لوگوں کو کہتے ہیں کہ پاکستانی بن جاؤ۔ آج سندھ کے تمام چھوٹے بڑے شہر اور ان میں موجود گھر و کاروبار نوکریاں اور بہت کچھ ہمارے پاس ہیں مگر پھر بھی ہم مظلومیت کا رونا روتے ہیں تاکہ مزید اگر کچھ مل سکتا ہے تو لے لیں۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہمیں مہاجر قوم کا پکا نام دینے والا شخص خود دس سالوں میں برطانیہ کا شہری بن گیا مگر ہم آج بھی مہاجر ہیں، اور تو اور ہمارے اس لیڈر نے ہماری قوم کی بیٹیوں کو بھی اس قابل بھی نہ سمجھا کہ ان سے شادی کرے اس نے شادی بھی کی تو بلوچوں میں سے۔ ہمارا لیڈر ہمیشہ سے اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح پاکستان کو توڑا جائے۔ اور پھر اپنے آبائی ملک ہندوستان سے مل جائیں مگر یہ کم بخت سندھی، سرائیکی، بلوچ، پنجابی اور پٹھان ہماری اس سازش کو سمجھ گئے ہیں۔ اور ہمیں ایسا کرنے نہیں دیں گے۔ ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ اندرون سندھ کے لوگ بہت ہی کسمپرسی کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس پینے کا صاف پانی تک میسر نہیں ہے تعلیم نہیں اسپتال نہیں۔ ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ اندرون سندھ کے لوگ بہت بری زندگی گزارتے ہیں اور ہم لوگ ان کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور آرام دہ زندگی شہروں میں گزار رہے ہیں۔ جہاں زندگی کی تمام تر سہولیات موجود ہیں۔ ہم دیہات میں جاکر رہیں گے بھی نہیں مگر دھرتی کے مالکان سے ان کے گاؤں دیہات بھی خالی کروانا چاہتے ہیں۔ بس ہمیں ایسا کرنے میں مزا آئے گا کیونکہ لوٹ مار اور احسان فراموشی تو ہمارے خمیر میں شامل ہے۔ ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ ہمیں سندھ میں کوئی تکلیف اور پریشانی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی مظلومیت کا رونا روئیں گے۔

ہم پاکستان کی واحد قوم ہیں جو ستر سالوں سے مہاجر ہیں حالانکہ ہماری چوتھی نسل یہاں چل اور پل رہی ہے۔ ہم پاکستان کی واحد قوم ہیں جنہوں نے قومیت کی بنیاد پر کسی سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی اور مہاجر قومی موومنٹ بنائی اور یہ بھی سن لیں کہ ہم نے لسانیت کی آخری حد کو چھوتے ہوئے مہاجر قومی موومنٹ کے تمام نمائندے کامیاب کروائے اور ان کو اسمبلیوں میں بھیجا، اور لسانیت کا الزام ان سندھیوں پر لگایا جنہوں نے آج تک ایک بھی قوم پرست سیاسی نمائندہ کسی بھی اسمبلی میں نہیں بھیجا۔ ہم لوگ بہت ہی امن پسند قوم ہیں اسی لئے ہمارے جھگڑے ہمیشہ سندھی بلوچ اور پٹھان سے چلتے رہتے ہیں۔

ہماری قوم سے صدر وزیر اعظم اور آرمی چیف تک بنے صوبائی و وفاقی وزراء بنے مگر پاکستان نے پھر بھی ہمیں کچھ نہیں دیا۔

ہماری یہ دیرینہ خواہش ہے کہ پاکستان میں موجود تمام قومیں اپنی اپنی زبان کو چھوڑ کر صرف اور صرف اردو زبان کا استعمال کریں حالانکہ ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ یہ سب لوگ پہلے سے ہی اردو زبان بولتے اور سمجھتے ہیں۔ جبکہ ہمیں ان کی کوئی بھی زبان نہ بولنا آتی ہے اور نہ ہی سمجھ آتی ہے۔ مگر پھر بھی یہ سب لوگ قوم پرست اور تعصبی ہیں اگر کہیں دس سندھی، بلوچی، پنجابی، سرائیکی یا پٹھان کھڑے ہوں گے تو سب اس ایک اردو بھائی کی وجہ سے اور اس سے یکجہتی کے لئے اردو زبان بولنا شروع کردیں گے۔ مگر افسوس ہمیں آج تک سندھی یا کوئی اور زبان بولنا نہیں آئی۔ ہم اپنے لیڈر کے پیچھے چلتے ہوئے سندھ دھرتی جس نے ہمیں اور ہمارے آباؤ اجداد کو پناہ دی اس میں الگ صوبہ بنانے کی بات کرتے ہیں۔ جبکہ ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے مگر ہماری فطرت میں جو تعصب اور بغض بھرا ہوا ہے اس کو کہیں تو ظاہر کرنا ہے۔

ہمیں تو یہ بھی پتہ ہے کہ اردو ہرگز ہماری زبان نہیں تھی۔ بلکہ ہمارے بڑے تو ہندوستان میں اپنی اپنی مادری زبان بولتے تھے۔ ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ اردو زبان ترکی، فارسی، عربی، ہندی اور سندھی زبان وغیرہ سے مل کر بنی ہے۔ مگر میں نہ مانوں والی بات ہے۔ جیسے ہی الیکشن قریب آئیں گے پھر ہمیں سندھی مہاجر بنا کر لڑوایا جائے گا۔۔۔ اور یوں سیاست چلتی رہے گی۔

Exclusive Interview

میمونہ حسین سینئر رہنما پاکستان تحریک انصاف کے ساتھ خصوصی انٹرویو

روحان اے طاہر نمائندہ لاہور انٹرنیشنل

آج ہمارے ساتھ پاکستان تحریک انصاف کی سینئر رہنما موجود ہیں آپ کسی تعریف کی محتاج نہیں یہ ایک افسانہ نگار، کالم نگار بھی ہیں اور سیاسی حلقہ اعتبار سے اپنی ایک پہچان رکھتی ہیں سوشل ورکر بھی ہیں ان سے ہم موجودہ سیاسی صورتحال پر گفتگو کریں گے۔

سوال۔ سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے ہمارے لاہور انٹرنیشنل لندن میگزین کے لئے وقت نکالا سب سے پہلے آپ اپنا تعارف کروا دیں کہ آپ نے کہاں پر تعلیم حاصل کی پی ٹی آئی میں کب اور کیسے شمولیت اختیار کی اور آپ کو اس (سیاست) کا خیال کیسے آیا؟

جواب: فیصل آباد میرا آبائی شہر ہے میں شروع سے یہیں رہی ہوں اور میں نے تعلیم بھی یہیں سے حاصل کی ہے۔ پاکستان تحریک انصاف میں کیسے آئی تو جب میری شادی ہوئی اللہ کا شکر ہے اللہ پاک نے اولاد کی نعمت سے نوازا گھر میں رہنے کے بعد احساس ہوا کہ کھانا پینا ہی صرف زندگی نہیں ہے۔ اکیلے اپنے لیے جینا زندگی نہیں۔ اللہ تعالی نے ہر انسان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد رکھا ہے تو بنا مقصد کے زندگی بڑی بے معنی دیکھائی دے رہی تھی اس لئے پھر میں نے سوچا ہمیشہ میری فیملی کی سیاست سے وابستگی رہی ہے۔ میرے ماموں بھی ایم پی اے رہ چکے ہیں اس لئے سیاست سے کافی تعلق تھا۔ عوام کو ہمیشہ مسائل میں گرے ہوئے پایا اور پریشان حال دیکھا تو سوچا کہ اللہ تعالی مجھے بھی اقتدار کی طاقت دے تا کہ میں عوام کے مسائل کو حل کر سکوں۔ اور اپنا کردار ادا کر سکوں تو یہ سوچتے ہوئے پہلے پہل تو لکھنے کا آغاز کیا۔ افسانہ نگاری، شاعری لکھتی تھی لیکن بہت تسلسل کے ساتھ نہیں لکھا کرتی تھی۔

سوال: آپ کا تعلق ادب سے ہے تو ادب سے آغاز کرنے کے بعد آپ نے سیاست میں کیسے قدم رکھا؟ کیا ادب اور سیاست دونوں مخالف چیزیں نہیں ہیں؟

جواب: بلکل درست ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ سیاست میں وہ بندہ کامیاب نہیں ہو سکتا جس کے دل میں احساس نہ ہو۔ جو درد محسوس نہ کرے۔ آپ لوگوں کی خدمت کے لیے آتے ہیں اگر آپ یہ تصور نہیں رکھتے اور آپ خود کو بہت اعلی کار سمجھتے ہیں تو آپ کو کبھی سیاست میں کامیابی نہیں ملتی۔ آپ جتنا درد دل رکھیں گے لوگوں کے مسائل کو حل کریں گے تو ہر بار بنا مانگے آپ کو ووٹ بھی ملے گا۔ ادب سے میرا تعلق بڑا پرانا ہے اسلیئے لکھنے کی طرف ذیادہ رجحان تھا جب میں نے سوچا کہ میرے پاس اقتدار کی طاقت نہیں ہے۔ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے کیسے عوام کیلئے آواز کو بلند کروں تو پھر میں نے قلم اٹھایا اور قلم کی طاقت کو آزمایا۔ الحمداللہ لوگ مجھے پڑھتے ہیں اور میں لوگوں کے مسائل پر لکھتی ہوں۔ اور میں آزاد لکھتی ہوں اُس پر کوئی بندش نہیں ہے جو میرے من میں ہوتا ہے اور جو میں اپنے لوگوں میں تکالیف دیکھتی ہوں، اُن کے مسائل دیکھتی ہوں میں اُن کو قلم بند کرتی ہوں۔

سوال: آپ نے پی ٹی آئی کا ہی انتخاب کیوں کیا اور کافی سیاسی جماعتیں تھیں؟

جواب: پی ٹی آئی کا انتخاب میں نے اسلیئے کیا کیونکہ عمران خان کا ایک وژن تھا اُن میں عوام کے لئے کچھ کرنے کی جدوجہد تھی۔ اس لئے میں اس تحریک کا حصہ بنی جس میں خواتین کی آواز کو دبایا نہیں جاتا تھا بلکہ خواتین کو امپاور کیا گیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ جتنی پاکستان تحریک انصاف میں خواتین کو عزت اور احترام دیا گیا شاید کسی اور جماعت میں اتنا دیا گیا پھر میں اس تحریک کا حصہ بنی۔ اس جدوجہد میں اپنا بھر پور کردار ادا کروں اپنی عوام کے لئے کچھ کروں کوئی ایسا لیڈر

آنا چاہیئے جو عوام کی سوچ کو بدلے اور ملک کے مسائل کو ختم کر سکے،عوام کو اُن کے مسائل سے نکال سکے تو مجھے سب سے زیادہ بہتر عمران خان دیکھائی دیئے اس لئے میں اس جماعت کا حصہ بنی۔

سوال: جیسا کہ آپ جانتی ہیں خان صاحب نے اقتدار میں آنے سے پہلے عوام سے کافی وعدے کیے تھے اقتدار کی طاقت ملنے کے بعد کوئی واضح تبدیلی سامنے نہیں آئی جیسا کہ وہ کنٹینرز پر چڑھ کے بات کیا کرتے تھے؟

جواب: دیکھیں تبدیلی کی عوام جو سوچ رہی ہے .وہ تبدیلی کوئی جادو کی چھڑی نہیں تھی کیونکہ 30 سال پرانی بیماریاں جو ہوتی ہیں اُسکا علاج آپ فوری طور پر نہیں کر سکتے .اور یہ بات کہ مہنگائی بہت ہے یا ٹیکسیز عام آدمی پر بہت بڑھ گئے ہیں درحقیقت ہماری قوم جب ٹیکس ادا کرے گی تو ہمیں قرضوں سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔ کہتے ہیں کہ اپنی چادر دیکھ کے پاؤں پھیلاؤ ہمیں وہ سسٹم رکھنا چاہیے۔آپ زیادہ دور نہ جائیں دوسرے ممالک جو کہ ترقی یافتہ کہلاتے ہیں چائنہ کی مثال لے لیں جو کہ ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہے اُنھوں نے سب سے پہلے جتنے بھی فضول اخراجات تھے جو اداروں پر بوجھ تھا اُنھوں نے ہر وہ چیز ختم کردی جو کہ اُن پر بوجھ بنی ہوئی تھی اسی طرح ہمیں پاکستان کے لئے بھی اہم اقدامات کرنے پڑیں گے۔

سوال: عمران خان صاحب کا عوام سے یہ بھی ایک وعدہ تھا کہ ہم آئی ایم ایف کے پاس نہیں جائیں جبکہ ہم نے کئی ممالک سے قرض لئے؟

جواب: قرض اُسی صورت میں ختم ہوگا کہ جب ہم جتنے بھی اشرافیہ ہیں جتنے اُمراء ہیں اُن سے پورا ٹیکس لیں اور عام آدمی بھی ٹیکس ادا کرے۔تبھی ہم قرضوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سسٹم کو ہم آہستہ آہستہ بہتری کی طرف لے جا رہے ہیں۔ مثلاً جھوٹ بولنے کی، حرام خوری کی عادت پڑ جائے تو وہ بندہ مرتا مر جائے گا لیکن عادت نہیں چھوڑے گا ہماری قوم کو یہ چیزیں سوچنی چاہئیں کہ یہ ہماری بہتری کے لئے ہیں۔آپ یورپ ممالک میں چلے جائیں وہاں پر اگر ٹھیلا بھی لگوانا ہے تو آپ کو منظوری لینی پڑے گی اور وہ ٹیکس بھی ادا کرتا ہے۔ یہاں آپ دیکھ لیں کہ ایک شاپ ہے اُس کے آگے ٹھیلا ہے اُس کے آگے پھر ایک ٹھیلا ہے کیا آیا وہ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔وہ کماتے ہیں وہ بھی پاکستان کی حدود میں رہ رہے ہیں تو کیا وہ پاکستانی نہیں ہیں کیا اُن کا حق نہیں بنتا۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہر بندے کو ٹیکس ادا کرنا چاہیئے یہ وہ دوراندیشی کی بات ہے جس سے ہم آنے والے وقت میں قرضوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم کشکول کو توڑنا چاہتے ہیں۔ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمیں قرض لینا پڑے۔ ہر دور اقتدار میں نئی حکومت پچھلی حکومتوں کا رونا روتی ہے اسطرح نہیں ہونا چاہیے۔آپ دیکھیں کہ جو اقتدار میں آتا ہے آپ اُس کے محل دیکھ لیں۔آپ پیپلز پارٹی کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں پیپلز پارٹی میں جتنے بھی لوگ آئے ہیں آج اُنھوں نے محل بنائے ہوئے ہیں ان کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا ہے۔آپ نون لیگ کو دیکھ لیں۔اُنھوں نے نہ صرف خود کھایا بلکہ اپنے ورکرز کو بھی کھلایا ہے۔آج اُن کے یہ الفاظ ہیں کہ اگر اُنھوں نے کھایا ہے تو لگایا بھی ہے یہ کیسی سوچ ہے۔

سوال۔اپوزیشن جماعتوں کے لیڈر جیلوں میں بند ہیں ملک میں احتساب چل رہا ہے کیا احتساب پارلیمانی طریق کار سے نہیں لیا جاسکتا کہیں یہ سیاسی انتقام تو نہیں ہے؟

جواب: دیکھیں مضبوط بندے کا احتساب بھی ایک عام بندے کی طرح ہی ہونا چاہیئے قانون سب کے لئے ایک جیسا ہونا چاہیئے اگر آپ قانون میں درجہ بندی کر دیتے ہیں تو قوم تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ ہماری قوم تباہی کے دہانے کی طرف چل رہی ہے۔آپ دیکھیں کہ اگر ہمارے یہاں ایک معمولی بندہ جو سائیکل چوری کرتے ہوئے پکڑا جاتا ہے جنھوں نے قوم کا اربوں روپیہ کھایا ہے کیا اُن کا احتساب نہیں ہونا چاہیئے .عوام کو یہ شعور بھی نہیں آیا کہ ان کے پیسوں سے ہی یہ لوگ اپنا کاروبار کر رہے تھے۔لندن میں فلیٹس خریدے جا رہے تھے اور عوام بدحالی کی طرف جا رہی تھی۔

سوال: اگر اپوزیشن جماعتوں سے احتساب لیا جا رہا ہے تو گورنمنٹ ملازمین اور ان کے اپنے وزراء کا احتساب تو عام آدمی کی طرح نہیں دیکھا گیا؟

جواب: گورنمنٹ کے لوگوں کا احتساب بھی ہو رہا ہے۔علیم خان کا ہوا، جہانگیر ترین کا ہوا۔علیم خان اپنے عہدے سے مستعفی ہوئے۔ایم این اے ہو کر بھی اُن سے عہدہ واپس لیا گیا۔ایک جیسا احتساب ہوا عمران خان صاحب کسی کو قصوروار دیکھتے ہیں تو وہ کبھی بھی لچک نہیں رکھتے کیونکہ اُن کا مقصد ہی یہ ہے کہ قوم کی لوٹی ہوئی دولت پاکستان میں لائی جائے اور ملک کے ترقیاتی کاموں پر خرچ کی جائے۔

سوال: عمران خان کی حکومت نے بجٹ پیش کیا جس پر اپوزیشن جماعتیں کافی اعتراضات کر رہی ہیں اور بجٹ کو عوام دشمن بجٹ کا نام دے رہی ہیں .اس بارہ میں آپ کیا کہنا چاہیں گی؟

جواب: دیکھیں عوام دشمن بجٹ جو اپوزیشن آج کہہ رہی ہے درحقیقت یہ دشمنی صحیح معنوں میں اُنھوں نے عوام کے ساتھ کی ہے آج وہ یہ بات کر رہے ہیں تب وہ ٹھیک تھے جب اسحاق ڈار نے بجٹ پیش کیا تھا۔ ماش کی دال اتنی مہنگی کر دی تھی

اورلوگوں کو کہتے تھے آپ چکن کھائیں، ماش کی دال نہ کھائیں۔اُن باتوں کو بھی یاد کرنا چاہیے۔انہوں نے مرغی کتنی مہنگی کردی تھی چونکہ وہ حمزہ شہباز بیچ رہا تھا۔آپ دیکھیں کہ جتنی بھی بنیادی ضروریات زندگی ہیں وہ اُس وقت یہ سب ٹھیک تھا جب اسحاق ڈار خود بھی کھاتا تھا دوسروں کو بھی کھلاتا تھا، وہ چیزیں ان کو درست لگ رہی تھیں تب کسی نے آواز نہیں اُٹھائی۔آج یہ شور اس لئے مچا رہے ہیں۔

سوال: ملک میں جتنی بھی سیاسی پارٹیاں ہیں ان تمام کے منشور اور نظریات مثبت ہوتے ہیں تو ایسا کیوں نہیں کرتے کے سب مل جل کر کام کریں؟

جواب: ہونا تو یہی چاہیے کہ اگر ایک جماعت پانچ سال دور اقتدار میں آئی ہے تو اس کو پورا کرنے دیں اپوزیشن کو کوئی مسئلہ دکھائی دیتا ہے تو اسمبلی میں بیٹھ کر بات کریں۔نون لیگ اور پیپلز پارٹی اگر ان کو عوام سے پیار اور محبت ہے تو اسمبلی میں بات کریں یہ عوام کو باہر نکالنے کی بات کرتے لیکن یہ اپنی سیاست چمکانے کے لئے عوام کی بات کرتے ہیں میں سمجھتی ہوں کہ دور اقتدار میں اگر حکومت کوئی فیصلہ کرتی ہے وہ بہتر نہیں لگتا تو وہاں پر سب کا بیان ایک ہونا چاہیے۔ یہ بات سب سیاستدانوں کو سوچنی چاہیئے کہ آج اگر پاکستان ہے تو ہم ہیں اگر خدانخواستہ پاکستان کو کچھ ہوتا ہے تو پھر یہ لوگ کیا کریں گے۔ہمیں پہلے ملک کی ترجیحات کا سوچنا چاہیے۔

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ عمران خان صاحب کے پیچھے فوج کا ہاتھ ہے اور ان کو فوج چلا رہی ہے۔اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

جواب: ایسا کچھ نہیں ہے وہ عوامی مینڈیٹ سے ہی وزیر اعظم بنے ہیں۔اپوزیشن والے اکثر یہ بات کہہ دیتے ہیں۔اُن کے کہہ دینے سے یہ بات ممکن نہیں ہوجاتی کیونکہ اپوزیشن کرنا بہت آسان ہے۔اپوزیشن میں آپ کوئی بھی بیان دے سکتے ہیں اگر اپوزیشن میں بیٹھ کر وہ یہ بات کہتے ہیں تو اُن کی بات کا بُرا نہیں منانا چاہیئے، درحقیقت ایسا کچھ نہیں ہے۔عوامی ووٹ سے وہ پارلیمنٹ میں آئے ہیں اور عوامی ووٹ سے وزیر اعظم بنے ہیں۔

سوال۔ پی ٹی آئی کا آئیندہ مستقبل میں کیا لائحہ عمل ہے؟

جواب: لائحہ عمل یہی کہ بجٹ میں کسانوں کو ریلیف دیا گیا ہے۔صنعت کاری کو مدنظر رکھا گیا ہے اور کوشش یہ ہے کہ ہمارے اپنے ملک کی اشیاء اتنی اچھی ہوں کہ ہمارے ملک کی ڈیمانڈ بڑھے اور دیگر شعبوں میں بھی اہم اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں جس سے ملک میں بہتری آئے گی۔

سوال: کیا محب وطن پاکستانی ہونے کے لئے انسان کا مسلمان ہونا ضروری ہے؟

جواب: نہیں پاکستان ہم نے اپنی مذہبی آزادی کے لئے حاصل کیا ہے اور دوقومی نظریے کی بنا پر ہم نے پاکستان کو حاصل کیا دو قومیں جن کے رسموں ورواج، عبادات مختلف ہیں۔جن کی ثقافت ایک نہیں اُس بنا پر ہم نے پاکستان حاصل کیا۔ پاکستان میں سکھ، ہندو، عیسائی اُن کے دل میں پاکستان کے لئے محبت ہے۔میں سوشل ورک بھی کرتی ہوں اُن لوگوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے۔وہ اپنے تہواروں میں مدعو بھی کرتے ہیں۔اور وہ کہتے ہیں کہ پاکستان ہماری دھرتی ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں اور ہمیں اپنے اقلیتوں کا احترام کرنا چاہیئے۔

سوال۔ اقلیتی جماعتیں تو پاکستان سے محبت بھی کرتی ہیں لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثریت اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے مثلاً آئے دن مذہبی انتشار اور اختلافات؟

جواب: مذہبی لحاظ سے آپ کا اظہار خیال مختلف ہوسکتا ہے یا جیسے ہمارے سارے فرقے ایک دوسرے سے مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ ہمارے نبی ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے قریب 72 فرقے ہونگے تو اُنکی باتیں غلط نہیں ہیں ٹھیک ہے کسی بات سے اختلاف رائے ہوسکتا ہے۔ہم ایک خدا ایک رسول ﷺ کے ماننے والے ہیں اور نبی پاک ﷺ کے اُمتی ہیں۔ہمیں پہلے یہ بات سوچنی ہے۔ہم اُس نبی ﷺ کے اُمتی ہیں جو کافروں پر بھی رحم کرتے تھے۔ہم لوگوں کو اُن کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے، پیار اور محبت سے رہنا چاہیئے اور پاکستان کو اپنے پیار محبت سے گلشن بنانا چاہیئے۔

(انٹرویو کی ویڈیو ملاحظہ فرمائیں لاہور انٹرنیشنل Youtube چینل اور ویب سائٹ پر)

کچھ پریس کانفرنس کی زبانی۔۔۔۔

(ذیشان محمود۔ پاکستان)

آج کل کچھ لکھنے کو نہ دل کر رہا ہے اور نہ وقت مل رہا ہے۔ لیکن موجودہ سیاسی صورتحال ایسی ہے کہ جس میں ہمارے پاس لکھنے کو بہت مواد ہے۔ چلیں کچھ بات میڈیا کی کرتے ہیں۔ ہمارے میڈیا کی بھی عجیب حالت ہے کس کی مانوں اور کس کی نہ مانوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ابھی ہضم بھی نہیں ہوتا کہ ہر چینل پر لائیو پریس کانفرنس کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ یکے بعد دیگرے کئی سیاسی شخصیات ایسے ٹی وی پر براجمان ہوتی ہیں کہ لگتا ہے بسترِ شب سے بادلِ ناخواستہ ناشتہ کر کے سیدھا پریس کانفرنس کرنے آ گئے ہیں اور اپنی تقاریر میں عوام کو واقعی کالانعام سمجھ کر مخالفین پر ایسے نشتر برساتے ہیں کہ الامان الحفیظ۔ بعض شخصیات کی مخالفین پر لفظی گولہ باری تو عوام کو ازبر ہو گئی ہے اور لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اگلی بات یا اگلا جملہ کیا ہوگا۔ اور اگر کوئی بات دہرانی رہ جائے تو قربان جائیں ہم اُن عظیم رپورٹرز اور صحافیوں کے جو بھولی ہوئی بات یاد کروا کر اپنے میڈیا چینلز کو بھرپور ریٹنگ کا موقع دیتے ہیں۔

جہاں تک شعبہ اطلاعات کا تعلق ہے تو فردوس عاشق اعوان صاحبہ وفاقی معاون خصوصی برائے اطلاعات ہونے کی وجہ سے سب پارٹیز کے اس شعبہ ہولڈرز پر بھاری ہیں۔ انکے تند و تیز چبھتے ہوئے جملے اور ٹوئیٹس میں خالص اور ٹھیٹھ پنجابی کلچر واضح نظر آتا ہے۔ جب وہ کہتی ہیں کہ ''رائیونڈ کی راج کماری اور کنیزیں'' تو لگتا ہے کہ وہ پنجابی میں کہنا چاہ رہی ہیں کہ ''اِنّی تو وڈی راج کماری''۔ اور کبھی کبھار تو لگتا ہے کہ اگر مریم نواز ان کے سامنے آ جائے تو خالص دیسی عورتوں کی طرح انہوں نے مریم نواز کو لتاڑ لینا ہے اور پھر ہم بھی جانتے ہیں کہ ظاہری ڈھیل ڈھول سے کس کی جیت ہونی ہے۔

پیپلز پارٹی کے مشیر اطلاعات سندھ مرتضیٰ وہاب دلائل اور ثبوتوں کے ساتھ ساتھ خاص اعتماد کے حامل ہیں اور مخالفین کو لتاڑ کر اپنا خوب دفاع کرتے ہیں۔ خیبر پختون خواہ اور بلوچستان والے بھی اپنا مدعا پیش کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ ہمارا میڈیا سندھ اور پنجاب کے مسائل اور یہاں کے نامور یا بے نام سیاست دانوں میں الجھا نظر آتا ہے اس لئے اُن دونوں صوبوں کو اتنی توجہ بھی حاصل نہیں رہتی۔ لیکن KPK کے شوکت یوسفزئی اپنی حکومت کا دفاع کرنا خوب جانتے ہیں۔ اور بلوچستان کے وزیر اطلاعات ظہور احمد بلیدی صاحب ہیں۔ نام بطور ریکارڈ درج ہے۔

آپ سوچ رہے ہیں کہ پنجاب کا ذکرِ خیر نہیں ہوا تو آپ کو بتاتا چلوں کہ پنجاب کے ایک سال میں تیسرے وزیر موصوف نے وزارت اطلاعات کی گدی سنبھالی ہے۔ لیکن کمال تو فیاض الحق چوہان میں تھا۔ خدا جانے سیاسی مخالفین کے کرتوتوں کا بیان ان کی زبان کو کڑوا کر دیتا تھا یا ان کی اپنی زبان چھری تلے دم نہیں لیتی تھی۔ بہرحال انہوں نے اپنی لفظی گولا باری سے سیاسی حریفوں کو واقعی ناکوں چنے چبوائے تھے۔ وائے حسرت کہ متنازعہ بیانات کے سبب ان کو نئے پاکستان کا سبق یاد نہ ہونے پر بھی چھٹی مل گئی۔ پھر صمصام بخاری ابھی کچھ بولے بھی نہ تھے کہ ان کو بھی ترقی مل گئی۔ اب میاں اسلم اقبال کی ترجمانی دیکھتے ہیں کہ پنجاب حکومت کا دفاع کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے یا بقول غالب:

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مُدعا کیا ہے

رہی بات مریم اورنگزیب صاحبہ کی تو ان کے پاس اپنی پارٹی کی طرح ہمیشہ دلائل اور ثبوتوں کی کمی رہی ہے اور وہ اپنا مدعا پیش کرنے میں ناکافی نظر آتی ہیں۔ ہاں پریس کانفرنس کرنے کے لئے اجتماعی یلغار ان کی پارٹی کا خاص وطیرہ ہے۔ فی الحال مریم صفدر اور شہباز شریف کا ذکر رہنے دیتے ہیں۔

بات شعبہ اطلاعات اور پریس کانفرنس کی ہو اور شیخ رشید احمد صاحب کا نام نہ آئے۔ ہمارے وزیر ریلوے تو ہمیشہ سے میڈیا کے سورما رہے ہیں۔ ان کی باتیں واقعی کسی کے لئے کبھی بھی پرانی نہیں ہوتیں۔ وہ ہمیشہ پرانی باتوں کو نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کو مخالین کی چیخیں ہمیشہ سنائی دیتی رہتی ہیں اس وجہ سے وہ جھاڑو پھرنے سے متعلق بیان دینے اور نرالی پیشگوئیاں کرنے سے باز نہیں آتے۔ ان کے مقابل پر کوئی سیاست دان ٹی وی سکرین پر رنگ نہیں جما سکتا۔

فواد چوہدری صاحب کو وزیرِ اعظم صاحب نے تبدیل تو کر لیا لیکن وہ سکرین سے زیادہ دور نہیں رہے۔ جیسے رویت ہلال کمیٹی کے سرکردہ افراد رمضان، شوال، عید الاضحیہ اور محرم کے چاند کی رونمائی کے لئے نظر آتے تھے اسی طرح نئی وزارت ملنے کے بعد موصوف بھی رمضان بھر اپنے کیلنڈر کو لے کر میڈیا پر آتے رہے۔ اس دوران چاند گرہن نپٹایا اور اب عید الاضحیہ کے چاند کا کیلنڈر لئے

میڈیا کے چینلز پر نمودار ہوئے ہیں۔

چاند دیکھنے سے ننگی آنکھ کی اصطلاح شرعاً مشروط ہے۔ننگی آنکھ کے محاورہ سے دو لوگ ہی خوش ہوتے ہیں۔ایک تو چاند کہ لوگ اسے ننگی آنکھ سے دیکھتے ہیں (خواہ چاند کی کوئی قسم بھی ہو)۔دوسرے ہمارے سیاست دان کہ لوگ ان کے کرتوت ننگی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ ہوسکتا ہے کہ وزارت سائنس وٹیکنالوجی نئے پاکستان میں ایسی ہی کوئی ٹیکنالوجی متعارف کروادے کہ عوام کرپٹ افراد کو ننگی آنکھ سے دیکھ کر ان کے کرتوت جان سکیں۔فواد صاحب کے لئے بقول شاعر:

بیانِ حُرمتِ صہبا صحیح مگر اے شیخ
تری زبان سے اُس کا مزہ نہیں جاتا

چلیئے ننگی آنکھ تو جملہ معترضہ تھا واپس پریس کانفرنس پر آتے ہیں۔ایک اور عجیب قسم کی پریس کانفرنس بھی اختراع کی گئی ہے۔وہ یہ ہے کہ ہمارے سپر سٹارز یا دیگر بڑی شخصیات کے عائلی معاملات کو میڈیا پر لا کر عوام کے سامنے پیش کرنا۔یہ بڑی قبیح بات ہے۔ہمارے ایک استاد کہا کرتے تھے کہ میاں بیوی کے معاملات چار دیواری سے باہر آنا ایسا ہی ہے کہ دونوں اپنے کپڑے اتار کر بازار میں گھومیں۔تو ہمارا میڈیا بھی یہی کر کے ریٹنگ حاصل کرتا ہے لیکن یہ لوگ اس کو میڈیا کی تائید خیال کرتے ہیں۔

آخر میں یہی کہنا ہے کہ زبان قوتِ گویائی کی علامت ہے۔ہم جو کچھ کہتے ہیں اور جتنا کچھ کہتے ہیں اُس کا ہمارے ذہن اور ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔دوست و دشمن تو اپنی جگہ پر ہوتے ہیں لیکن تعلقات میں ہمواری اور ناہمواری میں بہت کچھ زبان کے استعمال کو دخل ہوتا ہے کہ کون سا فقرہ کہا جائے کس طرح کہا جائے اور کس موقع پر کہا جائے۔ہم زبان کے استعمال اور اُس کے اچھے بُرے نتائج کی طرف توجہ نہیں دیتے اور ہمارے الفاظ یا تبصرے ہمارے ذہنی تجزیوں اور معاشرتی تجربوں کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ہم اُن سے بھی کوئی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے۔عموماً لوگ زبان کے استعمال میں عام طور پر پھوہڑ یا منہ پھٹ ہوتے ہیں اور الفاظ کے چناؤ میں احتیاط نہیں برتتے جو منہ میں آجاتا ہے کہہ جاتے ہیں۔یہی تکلیف کا باعث بن جاتا ہے اور دلوں میں گرہ پڑ جاتی ہے یہ زبان کے صحیح اور غلط استعمال سے ہوتا ہے۔زبان کے استعمال میں لب و لہجہ کو بھی دخل ہوتا ہے اور شیریں بیان آدمی محفل میں باتیں کرتا ہوا زیادہ اچھا لگتا ہے اور اپنی میٹھی زبان کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے۔خوش لہجے والا انسان خوش گفتار ہوتا ہے۔اللہ کرے کہ ہمارے معاشرے اور ہمارے حکمرانوں کے دل میں یہ بات اتر جائے۔

ہم دیوانے

ثاقب زیروی

دیوانے بھلا کب رُکتے ہیں رستے میں کھڑی دیواروں سے
ہم ہنستے کھیلتے گزریں گے طوفانوں سے منجدھاروں سے

صحراؤں کے تپتے سینے پر ہیں ثبت ہمارے نقشِ قدم
گلزار بنا کر کھیلتے ہیں ہم جلتے ہوئے انگاروں سے

آنکھوں میں چھلکتے رہتے ہیں تسلیم و رضا کے میخانے
خو د بڑھ کے گلے مل لیتے ہیں ہم چلتی ہوئی تلواروں سے

اُٹھے ہیں جو منزل کی جانب بڑھتے ہی چلے جائیں گے قدم
مرعوب نہ ہوں گے دل والے حالات کی ان یلغاروں سے

بیمار تمدّن کو ہم نے بخشی ہے نئی اِک تاب و تواں
دنیا کو محبت کرنا بھی سکھلایا ہے غم کے ماروں سے

صدیوں کے پرانے خوابوں کو ہم نے زندہ تعبیریں دیں
خوابیدہ فضائیں جاگ اُٹھیں اُبھریں جو اذاں میناروں سے

افلاک پہ روحِ ناصر دیں جھوم اُٹھی فرطِ مسرت سے
جب آئی نویدِ فتح و ظفر اسپین کے لالہ زاروں سے

دل تو ہے وہ نازک آئینہ جو بارِ سُخن بھی سہہ نہ سکے
فرمائیں نہ بس تکلیفِ کرم کہہ دے یہ کوئی غمخواروں سے

جس در کے گداؤں کے آگے فغفورِ زمانہ جھکتے ہوں
اس دَر کے گدا کو کیا لینا اس دُنیا کے درباروں سے

ثاقبؔ یہ کرم بھی کیا کم ہے ناصرؔ جو لیا طاہرؔ بخشا
ورنہ دیوانے مرجاتے سر ٹکرا کر دیواروں سے

سردار عبدالرب نشتر

تحریر خواجہ افتخار

سردارعبدالرب نشتر کا شمار پاکستان کے سرکردہ رہنماؤں میں ہوتا ہے۔انہوں نے صوبہ سرحد کے مسلمانوں کو کانگریس اور سرخ پوشوں سے نجات دلائی۔انہی خدمات کے پیش نظر قائداعظمؒ نے انہیں مسلم لیگ کے اس وفد میں شامل کیا تھا جو برطانوی وزارتی مشن سے گفتگو کے لئے مسلم لیگ نے ترتیب دیا تھا اور بعد ازاں عبوری حکومت میں بھی بحیثیت وزیر مواصلات انہیں شامل کیا گیا۔وہ بڑے اچھے مقرر تھے، بے حد مہذب تھے۔بے حد غیور تھے چنانچہ عبوری حکومت کے قیام سے چندروز قبل وائسرائے لاج کے باہر سردار پٹیل کی ہرزہ سرائی کے جواب میں اس کے منہ پر انہوں نے زوردار طمانچہ رسید کیا۔

انسانی خوبیوں کے اس حسین مرقع کے ساتھ ملاقات کا شرف مجھے ان دنوں حاصل ہوا جن دنوں پاک پنجاب کے پہلے انگریز گورنر سر فرانسس موڈی کی بر طرفی کی تحریک زوروں پر تھی۔انہی دنوں پنجاب کے نوجوانوں کا ایک وفد لے کر 30 جون 1949ء کے روز پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں مرحوم کی خدمت میں جب ہم حاضر ہوئے اور پنجاب کے انگریز گورنر کی برطرفی کا ان سے مطالبہ کیا تو لیاقت مرحوم نے اور باتوں کے علاوہ اس انگریز گورنر کی برطرفی کے سلسلے میں جو ہر قابل کی نایابی کا عذر پیش کیا تو ہم نے ان کی خدمت میں پنجاب کی گورنری کے لئے جو تین نام پیش کئے ان میں سردار عبدالرب نشتر کا نام سرفہرست تھا۔لیاقت مرحوم سے ملاقات کے ایک روز بعد کراچی کے نگار ہوٹل سے (جہاں ہم لوگ قیام پذیر تھے) ہم نے سردار صاحب کے دفتر فون کیا۔ان کے پرائیویٹ سیکرٹری نے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا۔علیک سلیک کے بعد ہم نے ان سے اپنا تعارف کراتے ہوئے سردار صاحب کے ساتھ ٹیلی فون پر بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔چنانچہ سردار صاحب اسی وقت ہم سے ہمکلام ہوگئے۔ہم نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم آپ کے آفس میں حاضر ہو جائیں۔ہماری استدعا کے جواب میں فرمانے لگے کہ آپ لوگ میرے دفتر میں مجھ سے ملاقات کرنے کے برعکس آج چار بجے میرے ''غریب خانے'' پر تشریف لے آئیں۔چائے کی میز پر بیٹھ کر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔

چنانچہ ہم نے ان سے ٹیلی فون پر ہی ان کی رہائش گاہ کا اتہ پتہ دریافت کیا اور مقررہ وقت پر سردار صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔انہوں نے اپنے گلابی چہرے پر ہمیشہ کھیلنے والی مسکراہٹ اور نہایت گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور وفد کے اراکین رانا محمد جہانگیر، ملک حامد سرفراز، پیر صلاح الدین، غلام حیدر سکھیرا اور راقم الحروف کے ساتھ فرداً فرداً مصافحہ کرنے لگے۔ان کے ڈرائنگ روم میں قائداعظمؒ کی تصویر کے علاوہ ان کی ذاتی تصویر بھی آویزاں تھی۔ایک دوسرے کی مزاج پرسی کے بعد ہم نے انہیں جب پنجاب کے انگریز گورنر کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کی تفصیل سنائی اور اس فتنہ پرور گورنر کی پشت پناہی کرنے والوں کی گھناؤنی سازشوں سے انہیں آگاہ کیا تو وہ نہایت محتاط انداز سے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ہمارے گزارشات کو سنتے رہے۔ہم نے انہیں بتایا کہ وزیر اعظم صاحب کو ہم نے واشگاف لفظوں میں بتادیا ہے کہ اگر پنجاب کے انگریز گورنر کو برطرف نہ کیا گیا تو حالات اس حد تک خراب ہو جائیں گے کہ ان پر قابو پانا حکومت کے بس کی بات نہ ہوگی۔

ہم نے سردار صاحب کو وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ ہونے والی بات چیت کے اس حصہ کی بابت بتایا جس میں لیاقت مرحوم وطن عزیز میں جو ہر قابل کی نایابی کا بہانہ تراش رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم نے جب سردار کو بتایا کہ ہم نے لیاقت علی خان صاحب کو انگریز گورنر کی جگہ تقرری کے لئے جو تین نام تجویز کئے ہیں ان میں آپ کا نام نامی اور اسم گرامی سرفہرست ہے تو ہمارے اس انکشاف کے جواب میں سردار صاحب اپنے دونوں ہاتھ کانوں کو لگاتے ہوئے ''توبہ توبہ'' کہتے ہوئے فرمانے لگے کہ خدا کے لئے آپ لوگ مجھے خواہ مخواہ کانٹوں میں نہ گھسیٹیں۔آپ نے پنجاب کی گورنری کے منصب کے لئے میرا

نام وزیراعظم صاحب کے پاس تجویز کر کے میرے ساتھ سخت زیادتی کی ہے۔ معاف کیجئے میرے ناتواں کندھے اس بوجھ کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پنجاب کی گورنری پھولوں کی سیج نہیں بلکہ یہ تو کانٹوں کا تاج ہے۔

ہم نے بڑے ادب کے ساتھ ان سے اختلاف کی جسارت کی اور کہا کہ سردار صاحب ہم آپ کو خوش کرنے کی خاطر یہ بات نہیں کہہ رہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت پنجاب کے طول وعرض میں جو آگ لگی ہوئی ہے اس کو آپ جیسا بے داغ، بےلوث اور معاملہ فہم قائد ہی اپنی خداداد صلاحیتوں سے فرو کر سکتا ہے۔

ہماری گزارش کے جواب میں انہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ زیر بحث موضوع سے ہٹا کر ہمیں ادھر ادھر کی باتوں میں لگا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے ان سے رخصت کی اجازت چاہی۔

کراچی کے دورہ سے فارغ ہو کر ہم لوگ لاہور پہنچے تو حمید نظامی، پنجاب مسلم لیگ کے صدر میاں عبدالباری اور خان ممدوٹ نے انگریز گورنر کی برطرفی کے مطالبے کو اس حد تک عوامی رنگ دے دیا تھا کہ ہماری مراجعتِ لاہور کے تین چار روز کے اندر انگریز گورنر اس بلند آہنگ عوامی تحریک کی مقبولیت اور اپنی مخالفت کی شدت سے گھبرا کر 13 جولائی 1949ء کو مستعفی ہو کر سمندر پار چلا گیا۔ سردار عبدالرب نشتر کو مرکزی حکومت نے پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا۔ وہ پاک پنجاب کے پہلے مسلمان گورنر تھے جن کے عہد اقتدار میں گورنر ہاؤس، شراب وکباب، طاؤس ورباب کی محفلوں، قمار بازی اور عیش ونشاط کی لعنتوں سے پاک ہوا۔

سردار صاحب اپنی تقرری کے بعد 2 اگست 1949ء کے روز کراچی سے لاہور تشریف لائے۔ لوگوں نے انہیں ہاروں سے لاد دیا۔ اس موقع پر استقبالیہ قطار میں جس جگہ ہم لوگ کھڑے تھے، وہ معززین شہر اور اعلیٰ سرکاری حکام سے مصافحہ کے بعد جب ہمارے قریب آئے تو ہم نے انہیں ہار پہنائے اور گلاب کی پنکھڑیاں ان پر نچھاور کیں وہ ہم سے فرداً فرداً مصافحہ کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ:

''شریر لوگو!......تم مجھے کانٹوں پر گھسیٹنے سے باز نہیں آئے۔ اب میری کامیابی کے لئے دعا کرنا''

ہم نے عرض کیا کہ سردار صاحب آپ اللہ کے نیک اور مخلص بندے ہیں۔ قدرت نے آپ کو بے پناہ خوبیاں عطا کی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اپنے ناخنِ تدبر سے پنجاب کی الجھی ہوئی گتھیوں کو بہت جلد سلجھالیں گے۔ ہماری دلی دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اس کے بعد وہ گورنر ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔

سردار صاحب نے گورنری کے منصب پر فائز ہو کر مسلم لیگ کے دونوں متحارب دھڑوں کے دلوں میں اپنے لئے عقیدت اور احترام کے جذبات جس انداز سے پیدا کئے وہ انہی کا حصہ تھا۔

ایک روز لاہور کے شاہی قلعہ میں باب عالمگیر کا افتتاح کرنے گئے تو وہاں منعقدہ تقریب کے دوران نوکر شاہی کے ایک افسر نے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے جب اس دروازے کا نام نشتر صاحب کے نام سے منسوب کرنے کا اعلان کیا تو سردار صاحب نے بھری محفل میں اس افسر کی اسی وقت بات کاٹ دی اور فرمایا کہ اس دروازے کا نام ''باب نشتر'' نہیں بلکہ ''باب عالمگیر'' ہی رہے گا اور میں اس بات کو قطعی طور پر پسند نہیں کرتا کہ مغلیہ دور کی اس عظیم یادگار کو میرے نام سے منسوب کیا جائے۔

ان کی درویشی کا یہ عالم تھا کہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے دفتر لاٹ صاحب (سول سیکرٹریٹ) سے ملحقہ مسجد میں عام شہری کی طرح جاتے۔ اس مسجد میں مولانا غلام محمد ترنم مرحوم کی بصیرت افروز تقریر کی کشش انہیں کھینچ لاتی تھی۔ مولانا ترنم کی خطابت کی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک پل میں لوگوں کو ہنسا دیتے تھے اور دوسری پل میں ایسی اثر انگیز باتیں کرتے کہ سامعین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ ان کی تقریر کی دوسری خوبی یہ تھی کہ سردار عبدالرب نشتر کی موجودگی میں حکومت اور افسروں کی غلط کاریوں کا نہایت جرأت سے پردہ چاک کرتے تھے۔

وہ پاکستان کے واحد گورنر تھے جنہوں نے اپنے بچوں کو کبھی بھی گورنر ہاؤس کی فلیگ کار یا سٹاف کار استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ انہوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ مشنری سکولوں میں داخل کرانے کے برعکس انہیں لاہور کے سنٹرل ماڈل ہائی سکول میں داخل کرایا اور یہ ریکارڈ کی بات ہے کہ ان کے بچے گرمی اور سردی کے موسموں کی شدت میں سائیکلوں پر سکول جایا کرتے تھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے

بچوں کو سونے کا نوالہ کھلانے اور انہیں شیر کی آنکھ سے دیکھنے کا قائل ہوں۔ایک مرتبہ ان کی گورنری کے زمانے میں ان کے ایک بیٹے نے کہا کہ ''اباجان آپ نے تو اپنی تمام زندگی درویشی کے عالم میں گزار دی ہے لیکن آپ نے کبھی ہمارے ''مستقبل'' کے بارے میں بھی سوچا ہے؟''

اس موقع پر سردار صاحب کے اس بیٹے نے اس وقت کے بعض برسر اقتدار اکابرین کے بیٹوں کی آسودہ حالی اور پرمٹوں کے حصول کا حوالہ بھی دیا اور کہا کہ آپ کی سخت گیری کا یہ عالم ہے کہ آپ ہمیں گورنر ہاؤس کی سٹاف کار بھی استعمال نہیں کرنے دیتے اور لاہور ایسے سکول میں ہمیں داخل کرایا ہے جہاں عام شہریوں کے بچے پڑھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

سردار عبدالرب نشتر نے اپنے بیٹے کے مذکورہ بالا شکوے کے جواب میں کہا کہ بیٹا! تم نے مجھ سے آج جو باتیں کی ہیں ان کا جواب تمام اہل خانہ کی موجودگی میں آج رات کھانے کی میز پر دوں گا۔ چنانچہ رات کا کھانا جب چن دیا گیا تو سردار صاحب نے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے بیٹے کے سوال کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں آج شام کی اس نشست میں ایک بات آپ لوگوں کے سامنے واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری اولاد یا خاندان کا کوئی فرد مجھ سے زندگی کے کسی موڑ پر یہ توقع نہ رکھے کہ میں اپنے اختیارات یا اثر ورسوخ کو استعمال کر کے آپ لوگوں کے لئے پرمٹوں، پلاٹوں اور فیکٹریوں کے اجازت نامے دلانے کے گناہ کا ارتکاب کروں گا۔

میری ایک بات کو غور سے سنیں! میرے والد محترم نے مجھے وکالت پاس کرانے کے لئے اپنا جدی مکان فروخت کر دیا تھا اور وہ اس جہانِ فانی سے جب رخصت ہوئے تھے تو میرے تعلیمی اخراجات کی کفالت کے باعث مقروض بھی تھے لیکن جب نشتر اس عالم ناپائیدار کو خیر باد کہے گا تو اپنی اولاد کو مقروض چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

سردار عبدالرب نشتر کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک وقوم کی خدمت کرنے میں بسر ہوا۔لیکن وہ جب تک زندہ رہے اپنے دامن کو روپے پیسے اور دھن دولت کی ہوس سے اس حد تک پاک رکھا کہ جب انہیں علالت کے باعث کراچی کے ایک ہسپتال میں داخل کیا گیا تو انہی دنوں ایک روز کیمبل پور کے معروف مذہبی وسیاسی رہنما پیر محی الدین لال بادشاہ المعروف پیر آف مکھڈ سردار صاحب کی عیادت کے لئے ہسپتال پہنچے تو سردار صاحب کے ذاتی معالج ڈاکٹر پراچہ صاحب کے ساتھ پیر صاحب کا آمنا سامنا ہو گیا۔ پیر صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے سردار صاحب کی علالت کا حال اور خیریت دریافت کی تو ڈاکٹر صاحب نے پیر صاحب کو بتایا کہ سردار صاحب کے لئے جن دوائیوں وغیرہ کی ضرورت ہے وہ کافی مہنگی ہیں اور سردار صاحب کے مالی حالات ایسے ہیں کہ وہ ہسپتال کے کمرے کا کرایہ ادا کرنے اور دوائیاں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ چنانچہ پیر آف مکھڈ جب سردار صاحب کی عیادت کے لئے ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے سردار صاحب کی مزاج پرسی کے کچھ دیر بعد سردار صاحب کی نظر بچا کر ان کے تکیہ کے قریب تین ہزار روپے رکھ دیئے اور سردار صاحب کو صحت وسلامتی اور درازئ عمر کی دعائیں دیتے ہوئے ہسپتال سے رخصت ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سردار صاحب نے کروٹ بدلی تو انہوں نے جب مذکورہ رقم اپنے سرہانے کے قریب پڑی دیکھی تو ان کے ایک خدمت گار نے انہیں بتادیا کہ ابھی ابھی جو پیر صاحب آپ کی عیادت کے لئے آئے تھے، وہ یہ رقم آپ کی نظر بچا کر آپ کے سرہانے رکھ گئے ہیں۔ چنانچہ سردار صاحب نے اسی وقت وہ رقم بذریعہ منی آرڈر پیر آف مکھڈ کے پتہ پر ارسال کر دی اور اسے قبول کرنے سے شکریہ کے ساتھ معذرت کر دی۔

اب کہاں دنیا میں ایسی ہستیاں

پاکستان کا یہ مخلص رہنما سردار عبدالرب نشتر 14 فروری 1958ء کے روز مختصری علالت کے بعد اللہ کو پیارا ہو گیا اور ان کے جسد خاکی کو قائداعظمؒ کے مزار کے قریبی احاطہ میں دفن کر دیا گیا۔

یہ کیا دست قضا کو کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے پھول چننا اور ویرانے میں رکھ دینا

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لئے مختصر دورانیے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی،........ہو۔ ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ....... اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔
ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

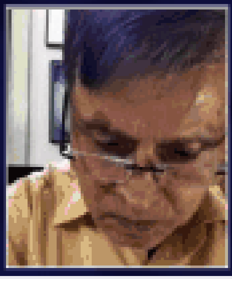

سندھ میں ہٹلر کلچر

تحریر احفاظ الرحمن

خانہ بدوش: لفظی ترجمہ، گھر کاندھوں پر۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہلکا پھلکا بوریا بستہ رکھتے ہیں۔ جب ایک جگہ سے جی اوب گیا، بوریا بستہ کاندھوں پر رکھا اور نئی منزل کی کھوج میں چل نکلے۔ خاصی مستند روایت ہے کہ رنگ برنگی ثقافت والے یہ لوگ ہمارے راجستھان سے نکلے اور ادھر ادھر پڑاؤ ڈالتے ہوئے پوری دنیا میں پھیل گئے۔ یہ ہے وہ، بے گھر لوگ چھوٹی موٹی چوری چکاری کر لیتے تھے۔ بڑے ڈاکے نیک کام ہوتے تھے، یہ بے چارے جنہیں یورپ میں ”ڈرما“ کہا جاتا ہے، ہر جگہ دھتکارے گئے۔ مگر دنیا میں انہیں اب بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہٹلر نے یہودیوں اور کمیونسٹوں کے ساتھ جپسیوں کا بڑی بے دردی سے قتل عام کیا۔

اپنے دور کے مقبول ترین شاعر ساحر لدھیانوی نے اپنے بے حد دل کش گیتوں کے مجموعے کا نام ”گاتا جائے بنجارا“ رکھا۔ بازار میں آتے ہی ہم نے مزید اور سینے سے لگا رکھا۔ تو اس نام سے یوں ہی محبت ہے، اب خبر سنی کہ حیدر آباد میں ”خانہ بدوش رائٹرز کیفے“ کو نوٹس دے دیا گیا ہے کہ بوریا بستہ باندھو، اور جزیرہ ”سارا کورا کاٹا“ میں جا کر پڑاؤ ڈالو۔ (اٹلس میں یہ نام تلاش کرتے رہیں)۔

ایک فخر دل میں اتر گیا۔ ارے مردود ہٹلر ابھی زندہ رہا ہے؟ خانہ بدوشوں کو چین سے نہ بیٹھے دے گا۔ سندھی ثقافت کے پیارے دل دادگان ڈھونڈو، سندھ میں کہاں کہاں ہٹلر بیٹھے دھرتی سے پریم کے گیت گا رہے ہیں۔ کتنے جیدو نامی گرامی، ڈاکو، رشوت خور، لیٹرے نیک نامی کی سند ماتھے پر چسپاں کیے لمبی لمبی کاروں میں پھرتے ہیں۔

اور یہ جو چند عورتیں جنہوں نے سورج کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا رکھا ہے، اس لیے مجرم اور معتوب قرار پائی ہیں کہ چالیس ملین کرائے کی مد میں واجب الادا ہیں، جیب سے نکالو، ورنہ ”سارا کورا کاٹا“ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔

ارے، چالیس ملین! اتنی بڑی رقم خانہ بدوشوں کی یہ ہمت کہ قومی خزانے پر بوجھ بنتے ہیں۔ ہاں ہمارے ہٹلروں اور ڈاکوؤں کی دلیری ہمارے لیے اور ہے۔ وہ ٹٹ پونجیے نہیں ہیں اربوں، کھربوں کا ڈاکا ڈالتے اور صاف بچ نکلتے ہیں۔ وہی ہمارے محکمہ ثقافت کے اصل نگراں ہیں۔ ان کے اعلیٰ معیار چرچا ہے۔ ان کے معیار پر تو راؤ انوار پورا اترتا ہے، ان کا ”بہادر اور لاڈلا بچہ“ ہے۔ جیسے یہ بہادری سے قومی خزانہ لوٹتے ہیں ویسے ہی راؤ انوار بچہ دلیری سے لوگوں کے قتل کرتا ہے۔ یہی لوگ ثقافت کو چار چاند لگا رہے ہیں۔

تو پاگل امر سندھو اور دیوانی عرفانہ ملاح تم نے ابتدا ہی میں غلط قدم اٹھایا۔ تم صحرا کو گلزار کرنا چاہتی ہو۔ ہٹلر کا ناپسندیدہ لفظ دھڑلے سے استعمال کر رہی ہو۔ خانہ بدوش۔ ارے کوئی اچھا سا نام چنا ہوتا جیسے ”وڈیرا کیفے“ ”داڑھیل ریسٹوراں“۔ اور تم یہ جو اپنے خانہ بدوش رائٹرز کیفے میں ادب اور ثقافت کے نام پر وڈیرا دشمن، داڑھیل دشمن کارروائیاں کرتی ہو، کیا اس کا انجام تمہیں معلوم نہ تھا۔ تم امن اور انصاف کا پرچم اٹھا کر داڑھیل معاشرے میں بغاوت کا بیج بوتی ہو۔ دنیا بھر کے باغی لکھاریوں کو سینے سے لگاتی ہو۔ تمہیں معلوم ہے، اصل مجرم تمہارا بار آور دماغ ہے۔ چالیس ملین تو ایک نیا بہانہ ہے۔ وہ بار بار تم دونوں اور تمہارے ساتھیوں پر ہاتھ ڈالتے ہیں، لیکن تم چکنی مچھلیوں کی طرح پھسل کر پھر گہرے طوفانی پانیوں میں جا نکلتی ہو۔

ارے امر اور عرفانہ، جانتی نہیں ہو، یہاں ”مجرا کلچر“ چلتا ہے۔ دیکھ لو، سیکڑوں ویڈیو کلپس موجود ہیں داڑھیل لوگ کسی عیاشانہ ترنگ کے ساتھ بلیک ڈاگ کی مستی میں مجرے والیوں پر نوٹ لٹاتے ہیں، اور دوسری طرف لاکھوں ماؤں کے ڈھانچوں جیسے بچے بھوکے سوتے ہیں۔ تمہیں یہی دکھ ہے نہ، اور تم نے جانے ایسے کتنے دکھ پال رکھے ہیں۔ تمھارے یہ دکھ میرے جیسے لاکھوں لوگوں کے خون میں گردش کرتے ہیں، آنکھوں میں چنگاریاں بھرتے۔ یہ یاد دلاتے ہیں کہ جھوٹ اور سچ کے درمیان، ڈاکوؤں اور انصاف کے لئے لڑنے والوں کے درمیان، ناداروں اور زرداروں درمیان ہونے والی جنگ جاری رہے گی، پھول کی خوشبوں امر، کانٹے ہمیشہ نفرت کا نشان بنتے ہیں۔ تمھاری تحریک پر بار بار یہ شعر ذہن کے افق پر جگمگاتا ہے۔

انہی کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

میں تمھارے ساتھ ہوں، تم سے پیار کرتا ہوں، آؤ تمھاری پیشانیاں چوموں اور داڑھیل لوگوں اور ہٹلروں کو پیغام سناؤں کہ تمھارے چہروں کی کالک امر اور عرفانہ کی صورت کے سامنے ہمیشہ گھٹنے ٹیکتی رہے گی۔

عاطف میاں: 'مالیاتی بحران کی بنیادی وجہ کرپشن سے زیادہ بیرونی قرضوں کا غیر پیداواری منصوبوں پر استعمال ہے'

ثقلین امام

عالمی شہرت یافتہ پاکستانی ماہر معاشیات ڈاکٹر عاطِف میاں نے کہا ہے کہ پاکستان کے موجودہ مالیاتی بحران کی بنیادی وجہ کرپشن سے زیادہ وہ بیرونی قرضے ہیں جنھیں غیر پیداواری اور غیر منافع بخش منصوبوں پر خرچ کیا گیا۔

بین الاقوامی مالیاتی ادارے آئی ایم ایف نے ڈاکٹر عاطف میاں کو پچیس روشن ترین نوجوان ماہرینِ اقتصادیات میں شامل کیا تھا۔ انھیں تحریک انصاف کی حکومت کے ابتدائی دنوں میں انھیں اکنامک ایڈوائزری کونسل میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی لیکن مذہبی حلقوں کے دباؤ کی وجہ سے ان کی شمولیت ممکن نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر میاں نے سنہ 2007 کے عالمی مالیاتی بحران کی وجہ بننے والے گھروں کے قرضوں سے شروع ہونے والے دیوالیے کا تجزیہ کیا تھا۔ یہ تجزیہ ایک کتاب ہاؤس آف ڈیٹ (قرضوں کے مکان) کے نام سے شائع ہوا تھا۔

بی بی سی اردو کے ساتھ ایک خصوصی انٹرویو میں ڈاکٹر عاطف میاں نے کہا کہ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ کرپشن نقصان تو پہنچاتی ہے، لیکن ہمارا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے جو ترقی کا ماڈل اپنایا ہے یہ اب بنیادی طور پر چل ہی نہیں سکتا ہے۔

کرپشن ہو یا نہ ہو، اب یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ یہ ماڈل اب مستقل بنیادوں پر چل سکے۔ جب تک آپ بیرونی طاقتوں پر انحصار کریں گے اپنی اقتصادی ترقی کے لیے، آپ کا ترقی کا یہ ماڈل اب چل ہی نہیں سکتا۔

قرضوں والا ماڈل کیا ہے؟

انھوں نے مزید کہا کہ اگر آپ چین یا مشرقِ بعید کے ایشیائی ممالک، مثلاً کوریا وغیرہ کی مثال لیں تو ان سب نے ان کی ترقی کی اصل اور بنیادی وجہ، ملک کی اندرونی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہے اور ان ممالک کی ترقی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔

ڈاکٹر عاطف میاں کہتے ہیں کہ ان قرضوں کو اگر ایسے منصوبے میں لگایا جائے جن سے اتنی آمدن نہ ہو جن سے یہ قرضہ اتارا جا سکے تو پھر ایسے قرضے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

انھوں نے مزید کہا کہ اسی لیے نہ صرف ہم نے قرضے لیے بلکہ ان قرضوں کی ایسی جگہوں پر سرمایہ کاری کی کہ اس سے معیشت کو زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔ اور ان قرضوں کو واپس بھی نہیں کیا جا سکا۔ اسی لیے ہم بار بار آئی ایم ایف کی طرف جاتے ہیں۔ بار بار بیل آؤٹ کی طرف جاتے ہیں۔

آئی ایم ایف کا 13واں پیکیج

1980 کی دہائی کے بعد سے اب تک پاکستان اپنے مالیاتی بحران سے نمٹنے کے لیے بارہ مرتبہ آئی ایم ایف سے رجوع کر چکا ہے اور موجودہ حکومت کا رجوع کرنا تیرھویں مرتبہ ہے۔

بار بار آئی ایم ایف کی طرف رجوع کرنے کے بارے میں ڈاکٹر عاطف میاں نے کہا کہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں جو اقتصادی ماڈل اپنایا ہوا ہے اس میں ایسی خرابیاں ہیں کہ ہر چار یا پانچ سال کے بعد ملک کی معاشی صورتِ حال بہت بگڑ جاتی ہے۔

اس ماڈل کی خامی

قرضوں والے اکنامک ماڈل کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عاطف میاں نے کہا کہ اس میں سب سے بنیادی خامی یہ ہے کہ اس میں یہ سوچا جاتا ہے کہ باہر سے قرضے لے کر یا کسی قسم کی امداد لے کر ملک میں ترقی دکھائیں۔

اس ماڈل میں مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک بیرونی پیسہ آ رہا ہوتا ہے تو اقتصادی ترقی کے اشارے نظر آ رہے ہوتے ہیں۔

جب قرضے بند ہو جاتے ہیں۔۔۔

ڈاکٹر عاطف میاں کہتے ہیں اس روپیہ سے نظر آنے والی ترقی عارضی اور وقتی ہوتی ہے، کیونکہ جیسے ہی وہ روپیہ آنا بند ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ معیشت بھی سست ہونا شروع کر دیتی ہے۔

باوجود اس کے کہ اس بیرونی قرضوں سے ملک میں سرمایہ کاری تو ہوتی ہے لیکن یہ سرمایہ کاری ایسے منصوبوں میں کر دی جاتی ہے جن سے ملک کی پیداواری

صلاحیت میں اضافہ نہیں ہوتا۔

اس لیے جب قرضے بند ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھیں واپس کرنا ہے اور جب وہ منصوبہ جس پر سرمایہ کاری ہوئی ہوتی ہے اس سے آمدن نہیں ہوتی ہے تو پھر اس منصوبے کے قرض کی رقم واپس کرنے کے لیے پھر سے قرضہ لینا پڑتا ہے، جسے بیل آوٹ کہتے ہیں۔

ڈاکٹر عاطف میاں کے مطابق، بیل آوٹ کی وجہ سے معیشت سست روی کا شکار ہوجاتی ہے، معیشت میں کمی ہونا شروع ہوجاتی ہے، اور آپ کے پاس زرِ مبادلہ بھی نہیں ہوتا ہے تاکہ آپ بیرونی قرضے کی ادائیگی کرسکیں۔

آئی ایم ایف کا ٹیکسوں کا ہدف

اس سوال کے جواب میں کہ آئی ایم ایف کا ایک ہدف کہ پاکستان اپنے محصولات (ٹیکسوں کے ذریعے آمدن) کو مجموعی قومی پیداوار کے دس فیصد حصے سے بڑھا کر پندرہ فیصد کرے، ڈاکٹر عاطف میاں نے کہا کہ یہ ہدف حاصل کرنا ہے تو نہ صرف مشکل، لیکن اگر یہ کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو یہ ملک میں پہلی مرتبہ ہوگا کہ ٹیکس ریوینیو میں اتنا بڑا اضافہ ہوگا۔

دنیا کے اگر دوسرے ممالک کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ٹیکس جی ڈی پی ریشو (ٹیکسوں کا مجموعی قومی پیداوار میں تناسب) اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر عالمی معیار سے موازنہ کیا جائے تو پاکستان کا یہ ہدف زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اس سوال پر کے پاکستان یہ ہدف گزشتہ ادوار میں کیوں نہیں حاصل کرسکا، ڈاکٹر میاں نے کہا کہ پاکستان میں ہر مسئلے کا اگر حل ڈھونڈیں گے تو اس کے حل ملک کے اندر ہی نظر آئیں گے۔

پچاس لاکھ مکانوں کی تعمیر

موجودہ حکومت کی پچاس لاکھ مکانات تعمیر کرنے کی پالیسی پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر عاطف میاں نے کہا کہ پاکستان کا اس وقت بنیادی مسئلہ بیرونی ادائیگیاں ہیں جس کے لیے برآمدات میں تیزی سے اضافے کی ضرورت ہے۔

آپ گھر بنا کر انھیں برآمد تو نہیں کرسکتے ہیں۔۔۔۔ جو کام آپ کو کرنا چاہیے یہ اس سے بالکل الٹ کام کریں گے اگر آپ ایسا کریں گے۔ (اگر یہ گھر بننا شروع ہوگئے) تو آپ کا کثیر سرمایہ اور لیبر ایک ایسے کام میں لگ جائے گی جسے آپ برآمد نہیں کرسکتے ہیں۔ بلکہ اس سے درآمدات بڑھیں گیں۔۔۔۔ اور بیرونی ادائیگیوں کا مسئلہ پیچیدہ تر ہوگا،

بنیادی مسئلہ ریاست کی صلاحیت میں کمی

جب ڈاکٹر عاطف میاں سے پوچھا کہ اس ہدف کو حاصل نہ کرپانے میں بڑا مسئلہ کیا ہے، آیا تقسیمِ دولت مسئلہ ہے، چوری ہے یا دفاعی بجٹ ہے تو انھوں نے کہا کہ اصل مسئلہ ریاست کی صلاحیت میں کمی ہے۔

اگر آپ نے کوئی بھی کام کرنا ہو، خاص کر پاکستان جیسے ملک میں جہاں غربت سمیت کئی مسائل ہیں، ایسے ملک میں ریاست میں اپنے اندر صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے کام سرانجام دے سکے اور انتظامی کام کرسکے۔ اس صلاحیت کو پیدا کرنا ہوگا اور بہتر کرنا ہوگا۔

ان کے مطابق یہ صلاحیت پاکستان کی ریاست کو خود سے پیدا کرنا ہوگی، یہ کام آپ کے لیے چین یا سعودی عرب یا امریکہ سے آکر تو کوئی نہیں کرے گا، یہ سب کام پاکستانی اداروں کے ذریعے ہی کرنا ہے، یہ صلاحیت تو خود ہی پیدا کرنا ہوگی لیڈر شپ بھی خود پیدا کرنا ہوگی۔

آئی ایم ایف سے رجوع کرنے میں تاخیر

اس سوال پر کہ کیا پاکستان کی موجودہ حکومت نے آئی ایم ایف کی جانب رجوع کرنے میں دیر کی جس کی وجہ سے تکالیف بڑھ گئی، ڈاکٹر عاطف میاں نے کہا جس حالت میں پاکستان تھا اس میں نہ صرف موجودہ حکومت نے دیر کی بلکہ یہ حالت نواز شریف کی حکومت کے آخری سال میں بھی بہت واضح تھی۔

تو ان حالات کا احساس نواز شریف کی حکومت کو اپنے آخری سال میں کرلینا چاہیے تھا، لیکن انھوں نے تاخیر کی کیونکہ وہ الیکشن میں جا رہے تھے۔

ڈاکٹر میاں نے کہا کہ پاکستان کے حکمرانوں کو قرضوں کی لت لگی رہی ہے یہ ایک بری عادت ہے جو ہمیں نشے کی طرح لگ چکی ہے۔ ماضی میں جو دو حکومتیں آئیں، بلکہ جب بھی حکومتیں انتخابات لڑ کر آتی ہیں تو ان پر دباؤ ہوتا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو کچھ دکھانا ہے۔

ان کے مطابق کارکردگی کے دکھانے کو دو راستے ہیں، یا تو مشکل طریقہ استعمال کریں جو کے دائمی طریقہ ہے، یعنی نظام کو بہتر بنائیں، اور اس کے ذریعے لوگوں کی صلاحیتوں میں اضافہ کریں۔

اس طرف جانے کی بجائے وہ آسان رستہ ڈھونڈتے ہیں کہ کسی طرح قرضے لے کے (کام چلالیں)، لیکن قرضہ لینے کا مطلب ہوتا ہے کہ جیسے آپ نے اپنی اگلی نسل کا مستقل گروی رکھ دیا ہو۔ (بشکریہ بی بی سی اردو)

کینیڈین سیاستدان کی ملالہ کے ساتھ تصویر زیر بحث کیوں؟

کینیڈا کے صوبے کیوبک کے وزیرِ تعلیم جان فرانسوا روبیرج کو امن کا نوبیل انعام حاصل کرنے والی دنیا کی کم عمر ترین شخصیت ملالہ یوسفزئی کے ساتھ تصویر بنوانے پر تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

ملالہ سر پر دوپٹہ پہنتی ہیں لہذا وہ کینیڈا کی اس صوبے (کیوبک) میں بطور معلم کام نہیں کر سکیں گی۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ دنوں کیوبک میں ایک متنازعہ قانون منظور ہوا ہے جس کے تحت سرکاری ملازمین بشمول اساتذہ پر یہ پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ اپنے کام کی جگہ پر مذہبی علامات (جیسا کہ سکارف، دوپٹہ، ٹوپی، پگڑی وغیرہ) نہیں پہن سکتے۔

وزیر تعلیم کے ساتھ لی گئی تصویر میں ملالہ کو سر پر دوپٹا اوڑھے دیکھا جا سکتا ہے۔

جان فرانسوا روبیرج نے کہا ہے کہ انھوں نے ملالہ کے ساتھ تعلیم تک رسائی اور عالمی ترقی کے بارے میں بات چیت کی۔

جون میں کیوبک میں ایک سیکیولر قانون منظور کیا گیا جو ایسے سرکاری ملازمین جو اختیار رکھنے والے عہدوں پر فائز ہیں وہ دفتری اوقات میں 'مذہبی علامات' جیسا کہ یہودی مذہب سے منسلک ٹوپی کیپہ، سکھ مذہب سے منسلک پگڑی یا اسلام سے منسلک حجاب نہیں پہن سکتے۔

یہ قانون ججوں، پولیس افسران، اساتذہ اور دوسرے سرکاری عہدیداروں پر لاگو ہوگا۔

اس متنازعہ قانون پر کافی بحث بھی جاری ہے جبکہ اس کے خلاف صوبے میں احتجاج بھی ہوا ہے۔

اس قانون کے حمایت کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ کیوبک میں ریاست اور گرجا گھر (مذہب) کو الگ رکھنے کے اصول کو متعارف کروانے کے لحاظ سے کافی مناسب اقدام ہے۔

اگرچہ یہ قانون کسی ایک مذہب سے متعلقہ نہیں ہے تاہم ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ صوبے میں بسنے والی مسلمان خواتین کے ساتھ ناانصافی ہے جو حجاب یا کسی دوسرے طریقے سے اپنا سر ڈھانپتی ہیں۔

سماجی رابطوں کی ویب سائٹس پر کچھ لوگوں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے وزیر تعلیم کو ملالہ کے ساتھ تصویر بنوانے پر 'منافق' تک کہہ دیا۔

وزیر تعلیم کی ملالہ سے ملاقات فرانس میں ہوئی تھی۔

ٹویٹر پر صحافی ندیم سلیم والجی نے ان سے سوال کیا کہ اگر ملالہ کیوبک میں بطور معلم پڑھانا چاہیں گی تو وہ کیا کریں گے؟

وزیر تعلیم نے قانون کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ 'میں یقیناً نہیں کہتا کہ یہ اعزاز کا باعث ہوگا۔ فرانس کی طرح (جہاں ہم ہیں) کسی بھی دوسرے آزاد اور برداشت کا پرچار کرنے والے ممالک کی طرح کیوبک میں اساتذہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے دوران مذہبی علامات نہیں پہن سکتے۔'

آسٹریلیا: دو ہزار سالہ کیتھولک رسم قانون کی زد میں

تحریر ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔آسٹریلیا

آسٹریلیا کے کیتھولک کلیسیاؤں اور ان کے زیرانتظام سٹوڈنٹ ہاسٹلوں وغیرہ میں کچھ پادریوں کی طرف سے سالہا سال سے مسلسل روا رکھے گئے بدترین جنسی جرائم اور ان کے گھناؤنے کردار کی تفتیش کرنے والے رائل کمشن کی رپورٹ منظر عام پر آئی ہے۔جس میں سفارش کی گئی ہے کہ باقاعدہ قانون سازی کرکے لگ بھگ دو ہزار سالہ پرانی کیتھولک رسم کو، جسے کنفیشن (Confession) یعنی اعتراف گناہ کہا جاتا ہے، قابل دست اندازی پولیس جرم قرار دے دیا جائے، خاص طور پر ان گناہوں کے معاملہ میں جو ملکی قانون کے مطابق جرائم شمار ہوتے ہیں۔ (https://www.abc.net.au/news/2018-08-14)

اس رسم کے مطابق کوئی بھی شخص، جس نے مسیحی مذہب اختیار کرنے کی خاطر بپتسمہ لے لیا ہو، ہر قسم کے ارتکاب جرم کے بعد چرچ میں جا کر کسی پادری کے پاس حاضر ہو کر سرگوشی کے انداز میں اپنے گناہ یا جرم کا اقرار کرتا ہے جس کے بعد پادری اسے بخشش کی نوید دے دیتا ہے۔یہ رسم تنہائی میں اور عموماً پس پردہ رہ کر ادا کی جاتی ہے۔اس رسم کو Sacrament of Forgiveness بھی کہا جاتا ہے۔

مذکورہ عدالتی کمشن کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ گزشتہ کتنی ہی دہائیوں سے نابالغ یا بے بس افراد کے ساتھ جنسی زیادتی کرنیوالے پادری اس رسم کے ذریعہ آپس میں ہی ایک دوسرے سے یہ قبیح جرم بخشوا لیا کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ اعتراف گناہ کی یہ رسم بائبل کے عہدنامہ جدید کی کئی عبارات کو بنیاد بنا کر کے شروع کی گئی تھی۔مثلاً ''پس ایک دوسرے کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا کرو اور ایک دوسرے کے لئے دعا مانگا کرو تا تمہیں زندگی ملے'' (جیمز باب5 عبارت16)، تم کسی کے گناہ بخشو گے تو اس کے گناہ بخش دئے جائیں گے'' (یوحنا باب20 عبارت24) وغیرہ۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں نے بھی مطالبہ کیا کہ پادریوں کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ آئیندہ اگر ان کے پاس کوئی بھی شخص اس قسم کے جنسی جرائم کا اعتراف کرنے آئے تو وہ اس کا یہ گناہ بخشنے کی بجائے فوری طور پر پولیس کو اطلاع دیں۔

اس مطالبہ پر کیتھولک چرچ کی طرف سے احتجاج کیا گیا کہ اس قسم کی قانون سازی کیتھولک مذہب کے مسلمہ قوانین اور تعلیمات میں حکومتی دخل اندازی کے مترادف سمجھی جائے گی اور یہ آسٹریلوی آئین میں دی گئی مذہبی آزادی سے بھی متصادم ہوگی۔کیتھولک چرچ کے اس نکتہ نظر کو عوام وخواص نے بری طرح رد کر دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اگر کیتھولک مذہب کے قوانین ہمارے بچوں کی عصمت کے تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتے تو انہیں ملکی قوانین کے ماتحت لانا انتہائی ضروری ہے۔

دنیا بھر میں ہونے والی کیتھولک چرچ کی بدنامی اور اس سے وابستہ لکھوکھا عقیدت مندوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی حیرت، شرم اور مایوسی کا اثر زائل کرنے کے لئے پوپ فرانسس نے اس سال مارچ میں اعلان کیا کہ چرچ کے زیرانتظام ریاست ویٹیکن (جو محض 110 ایکڑ رقبہ پر مشتمل ہے) اور دنیا بھر میں موجود اس کے سفارت خانوں میں اگر اس قسم کا کوئی واقعہ سامنے آتا ہے تو اس کی رپورٹ مرکزی چرچ کو نہ کرنیوالے کو جرمانہ کیا جائے گا اور جیل بھی ہوسکتی ہے۔عوام الناس نے پوپ کے اس اعلان کو بھی ناکافی اور مایوس کن قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ اس حکمنامہ کا اطلاق دنیا بھر کے کلیسیاؤں اور ان کے زیرانتظام چلنے والے تمام اداروں پر بھی ہونا چاہئے۔پوپ فرانسس نے یہ وضاحت بھی نہیں کی کہ ایسے کسی شخص کو جرمانہ اور جیل کی سزا کے علاوہ اس کے عہدے سے معزول بھی کیا جائے گا یا نہیں۔اور اسی طرح اس واقعہ سے متاثر ہونے والے فرد کو چرچ کی طرف

سے کوئی تاوان بھی ادا کیا جائے گا یا نہیں۔اسی طرح سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا ہے کہ اس قسم کے واقعات کی اطلاع چرچ کے مرکز کو نہیں بلکہ مقامی پولیس کو دیئے جانے کا حکم جاری ہونا چاہیئے تھا۔(نیشنل پبلک ریڈیو ڈاٹ آرگ۔امریکہ۔اشاعت 29 مارچ 2019)۔

ادھر آسٹریلیا کی ایک ریاست نے مئی میں اعلان کیا ہے کہ جلد ہی قانون سازی کر کے تمام پادریوں اور مذہبی رہنماؤں کو اس قسم کے جرائم کی اطلاع فوری طور پر پولیس کو دینے کا پابند کر دیا جائے گا۔

یہ بیان کرنا بھی مناسب ہوگا کہ جب سولہویں صدی عیسوی میں مسیحی دنیا میں پروٹیسٹنٹ تحریک چلی اور اس کے نتیجہ میں کئی نئے مسیحی فرقے وجود میں آ گئے تو ان میں سے اکثر نے مذکورہ رسم کو ترک کر دیا اور اعلان کیا کہ گناہ معاف کرنے کا اختیار کسی پادری یا کلیسیا کے پاس نہیں ہے۔کہا جاتا ہے کہ اس سے قبل دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں سب سے پہلے کیتھولک مذہب کے ہی ایک رومن رہنما سینٹ ہپولیٹس (Saint Hippolytus) نے اعتراض کیا تھا کہ ہر قسم کے خطرناک مجرموں کو کنفیشن کی رسم کے ذریعہ چرچ کی پناہ میں لے آنا کوئی اچھا فعل نہیں۔

متعدد پروٹیسٹنٹ فرقوں نے کنفیشن کی رسم کے خاتمہ کے علاوہ اپنے پادریوں کے لئے رہبانیت اختیار کرنے (یعنی مجرد زندگی گزارنے) کی پابندی بھی ختم کر دی تھی۔

اسلام نے، جو کہ دین فطرت ہے، آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل رہبانیت کو ناپسندیدہ قرار دے دیا تھا۔کیتھولک مذہب میں پادریوں پر شادی نہ کرنے اور مجرد رہنے کی پابندی اس طبقہ میں مذکورہ جرائم کو جنم دینے کا سب سے بڑا باعث ثابت ہوئی ہے۔لیکن بدقسمتی سے برصغیر پاک و ہند کے اخبارات میں آئے روز کچھ مولویوں (جن میں ائمہ مساجد، مدرسین مدرسہ شامل ہیں) کے بارہ میں بھی اسی قسم کی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔خبر پھیلنے پر ارباب اختیار بھی اور سوشل میڈیا یہی کہہ کر بات کو گول کر دیتا ہے کہ یہ شخص (یا اشخاص) نہ تو مسلمان کہلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی انسان۔لیکن اس قسم کی تصوراتی، نظریاتی، جذباتی قسم کی یا خود فریبی پر مبنی بیان بازی نہ تو مجرم کو قرار واقعی سزا دے سکتی ہے اور نہ ہی وبا کی طرح پھیلے اس معاشرتی روگ کی روک تھام کرتی ہے۔

غزل

درثمین طاہر

گمنام سی جگہ پر بے نام سی قبر ہو
پر میرے پیارے مولیٰ اس پر تری نظر ہو

گذری قیامتوں کو ہے کون یاد رکھتا
جو آنے والے دن ہیں ان میں ترا ہی ڈر ہو

جو سال بھر ہرا ہو اور پھل سے بھی بھرا ہو
یا رب کبھی جہاں میں ایسا بھی اک شجر ہو

دل سب کا شاد رکھوں گھر پاک صاف رکھوں
مولیٰ اے کاش مجھ میں ایسا ہی کچھ ہنر ہو

دن کے کڑے سفر میں دل میں ہوں تیری باتیں
اور رات کو بھی مالک تو میرا ہمسفر ہو

ہو خود بخود ہی دل کی آہٹ کو سننے والا
میرے قریب یا رب ایسا کوئی بشر ہو

جس کی ہو مصطفیٰ سے گہری بہت محبت
اس رہ گزر میں یارب میرا وہ ہم سفر ہو

برطانیہ کے بادشاہ نے اپنے کزن زار روس کو کیسے دھوکہ دیا

تحریر ہارون ملک

یہ 13 جون 1917 کی رات کا آخری پہر ہے جب جرمنی کے زیرِ تسلط بیلجیم سے کُچھ بمبار طیارے اُڑتے ہیں۔ اُن کی منزل لندن ہے۔ صُبح صُبح وُہ لندن کے مشرقی حصے پر پُہنچتے ہیں۔ پاپلر کے اپر نارتھ سٹریٹ سکول میں بچوں نے اپنی ریاضی کی کلاس بس شروع ہی کی ہے۔ ایک بچے کے آنکھوں دیکھے حال کے مُطابق "میں ابھی اپنا پانچواں سوال حل کر رہا تھا کہ باہر طیاروں کی آوازیں سُنائی دیں میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ یہ اپنے مُلک کے جہاز ہیں تب ہی بم دھماکوں کی خوفناک آواز سُنائی دی اِس حملے میں اٹھارہ چھوٹے معصوم سکول کے بچے اپنی جان کی بازی ہار جاتے ہیں جبکہ اُس دِن لندن میں ایک سو باسٹھ افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

یہ بات بُہت خطرناک تھی اِس سے پہلے لندن میں شہریوں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُن جرمن بمبار طیاروں کا نام گوتھا بمبار اور شاہی خاندان جو برطانیہ پر بادشاہت کر رہا تھا اُس کا نام سیکس کوبرگ گوتھا تھا۔ یہ بُہت غلط شروعات ہونے والی تھیں کیونکہ جرمن طیاروں اور برطانوی شاہی خاندان کے ناموں میں مماثلت بُہت زیادہ تھی۔ لندن کے شہریوں میں جرمن اور جرمن سے جُڑی ہر چیز اور نام سے نفرت بڑھ رہی تھی حتیٰ کہ جِن دُکانوں کے نام جرمن تھے اُن پر بھی بلوائیوں کے حملے ہونے لگے اور جو جرمن شہری لندن میں رہ رہے تھے اُن کی زندگیاں بھی خطرے میں تھیں۔

موجودہ برطانوی شاہی خاندان یعنی رائل ہاؤس آوو ونڈسر Royal House of Windsor نے ابھی کُچھ عرصہ پہلے ہی اپنے حالیہ نام کے ساتھ برطانیہ پر بادشاہت کے سو سال سلیبریٹ کیے ہیں۔ یہ خاندان اب دُنیا کا سب سے مشہور شاہی خاندان ہے۔ جب دُوسری بادشاہتیں اور سلطنتیں بکھر رہی تھیں تب انہوں نے ترقی کی۔ اُنھوں نے اپنے دُوسرے شاہی خاندان کے رشتہ داروں کو معزول ہوتے، جلا وطن ہوتے اور حتیٰ کہ مرتے بھی دیکھا۔ اپنے خاندان میں بغاوت اور غداری دیکھی۔ ونڈسر نے اپنی بقا کا سبق سو سال پہلے پہلی جنگِ عظیم میں سیکھا۔

شاہی خاندان کو لندن میں بڑھتی نفرت سے اندازہ ہُوا کہ اُن کا اپنا جرمن نام کا برانڈ دُرست نہیں لہٰذا اب تبدیلی ضروری تھی۔ اگست 1914 میں جب بادشاہ اُنچاس سالہ جارج پنجم تھا جو ایک نرم خُو سا بادشاہ تھا۔ بادشاہ بننے سے پہلے وُہ محض تیتر یا دیگر جانوروں کا شکار کیا کرتا تھا۔ جارج پنجم جنگجو یا بُہت زیادہ انسپائرنگ بالکل بھی نہیں تھا اور وُہ شِکار کے عِلاوہ ٹکٹیں جمع کرنے کا شوقین تھا۔ بقول ادیب ایچ جی ویلز بادشاہ "alien and uninspiring" تھا اور بادشاہ کا اصل مسئلہ بھی یہی تھا کہ وُہ اجنبی تھا، اُس کی رگوں میں انگلش خُون نہیں تھا۔

اُس کے والد ایڈورڈ ہفتم مکمل جرمن جبکہ ماں یعنی ایڈورڈ ہفتم کی بیوی ڈنمارک سے تھیں جبکہ جارج کی دادی یعنی ملکہ وکٹوریہ بھی جرمن تھیں اور البرٹ یعنی ملکہ وکٹوریہ کے شوہر بھی کوبرگ سے تھے یعنی ایک اور جرمن۔ اِس کا سادہ سا مطلب یہ تھا کہ وُہ ایک مکمل غیر مُلکی تھے۔ ایڈورڈ ہفتم ایک مکمل جرمن تھے جبکہ اُس کا بیٹا جارج

زار نکولس اور کنگ جارج

پنجم جو اِس پوسٹ کا اہم کردار بھی ہے وُہ پہلا برطانوی بادشاہ تھا جس نے ونڈسر کا نام استعمال کیا، جارج پنجم ہاف جرمن اور ہاف ڈینش (ڈنمارک) تھے یعنی تکنیکی طور پر اُن کی رگوں میں بھی انگریز خون نہیں تھا۔

ملکہ وکٹوریہ کے نو میں سے آٹھ بچوں نے یورپ کے دُوسرے شاہی خاندانوں میں شادیاں کیں۔ پہلی جنگِ عظیم سے پہلے زیادہ تر یورپی بادشاہتوں پر ملکہ برطانیہ وکٹوریہ کے نواسے، پوتے پوتیاں براجمان تھے۔ جارج پنجم رُوس کے زار نکلس دوم اور جرمن قیصر ولہم کے فرسٹ کزن بھی تھے۔ جارج پنجم کی وائف کوئین میری بھی جرمن تھیں جو جرمن لہجے میں انگریزی بولتی تھیں۔

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہُوئی تو جارج پنجم کا خیال تھا کہ چُونکہ یورپ کے زیادہ تر ممالک پر اُس کے کزنز ہی بادشاہت کر رہے ہیں تو یہ جنگ جلد ختم ہوجائے گی لیکن چند ہی ماہ میں اُس کی یہ غلط فہمی دُور ہوگئی۔ عوام کا مُوڈ بھی بُہت جارحانہ تھا۔ اینٹی جرمن فسادات اور جرمنوں سے نفرت اپنے عُروج پر تھی۔ یورپ کی بادشاہت کا نظام بھی خراب ہو رہا تھا مارچ 1917 میں جارج پنجم کو اپنے فرسٹ کزن زار اور رشیا نکلس دوئم کی معزولی کی خبر مِلی۔ یہ بادشاہت کے بین الاقوامی کلب کو پہلا شدید جھٹکا تھا۔ بچپن سے ہی زار یعنی نکولس دوئم اور جارج نے بارہا اکٹھے چھٹیاں گُزاری تھیں۔ جارج نکولس کو پیار سے نکی کہتا تھا اور اُسے اپنا سول میٹ کہتا تھا۔ 19 مارچ 1917 کو جارج نے نکولس کو ٹیلی گرام بھیجا اور اُسے تسلی دی کہ وُہ فِکر نہ کرے وُہ اُسے جلد ہی رُوس سے نِکال لے گا۔

نکلس کی معزولی کے بعد وہاں کی حکومت نے برطانوی سفیر سے کہا کہ اگر رومانف فیملی یعنی معزول شاہی خاندان کو برطانیہ اسائلم یعنی پناہ دے دے تو یہی بہتر ہوگا کیونکہ یہاں پر اُن کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ اُس وقت کے برطانوی وزیرِاعظم ڈیوڈ لوئیڈ جارج نے ابتدا میں اپنے سفیر کو اسائلم دینے کی حامی بھرلی۔ بادشاہ جارج پنجم کے پرائیویٹ سیکریٹری لارڈ سٹیمفورڈھم نے بادشاہ کو مشورہ دِیا کہ رُوس کے بادشاہ کی معزولی پر شاہی خاندان یعنی آپ تو پریشان اور دُکھی ہیں لیکن برطانوی عوام اِس انقلاب پر بہت خُوش ہے کیونکہ وُہ زار کو ظالم اور مسلط بادشاہ سمجھتے ہیں۔ اُدھر برطانوی عوام میں موجود سوشلسٹ اور رپبلکنز کی ایک بڑی تعداد نے رُوسی انقلاب کی خُوشی اور حمایت میں ریلیاں نکالیں۔ سٹیمفورڈھم نے ایک فائل مرتب کی جس کا نام تھا ملک میں بے چینی۔ اِس فائل میں خُفیہ اطلاعات وغیرہ بھی شامل تھیں۔ اب یہ تمام کاغذات ایک فائل کی صُورت میں ونڈسر کاسل میں صدیوں پُرانے دُوسرے لاکھوں شاہی ریکارڈز کے ساتھ موجود ہیں۔

خیر اس دوران دو تین ہفتے گُزر گئے اور نکولس یہ سمجھتا رہا کہ ابھی تک وزیرِاعظم لائیوڈ جارج باقاعدہ اسائلم کا حکم جاری نہیں کر سکے لیکن ایسا نہیں تھا کیونکہ 6 اپریل 1917 کو ونڈسر کاسل سے ایک شاہی خط فارن سیکریٹری آرتھر بالفور کو بھیجا گیا کہ رُوس کے بادشاہ کا یہاں آنا عوام میں بے چینی اور نفرت کو بڑھا وادے گا۔ دُوسرا خط بھی اُسی دِن روانہ کیا گیا جس میں بادشاہ نے عندیہ دیا کہ وُہ پہلے دی گئی اسائلم کی اجازت کو عوام کی ناراضگی کو مدِنظر رکھتے ہُوئے واپس لے لینا ہی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ کیونکہ کنگ جارج کو یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر زار یہاں انگلینڈ آتے ہیں تو اُن کی اپنی بادشاہت شدید خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ بہرحال فارن سیکریٹری نے وزیرِاعظم برطانیہ سے ڈسکس کیا اور اِس طرح وزیرِاعظم اور کابینہ نے اسائلم کی اجازت واپس لینے کا فیصلہ کیا۔

زار نکلس اور کنگ جارج

رُوس میں زار اپنے کزن کے اِس فیصلے سے بے خبر تھا اور برطانیہ روانگی کی تیاریوں میں تھا۔ چھ ماہ بعد ہی رُوس پر اقتدار پر بولشویک پارٹی کا قبضہ ہوگیا۔ اب زار اور اُس کی فیملی کو یکاٹیرن برگ میں ایک گھر میں مُنتقل کیا گیا۔ جہاں جلد ہی آدھی رات کو تہہ خانے میں نکولس اپنی بیوی اور پانچ بچوں سمیت قتل کر دیے گئے جبکہ لینن کی حکومت یہ جُھوٹ پھیلاتی رہی کہ صرف نکولس کو مارا گیا ہے جبکہ اُس کی فیملی کو برطانیہ بھیج دیا گیا ہے۔

بہرحال اِن تمام واقعات کے بعد بالآخر کنگ جارج نے زار کی بہن زینیا

اور اُس کے بیٹے پرنس آندرے کو انگلینڈ آنے کی اجازت دے دی۔ (برطانوی جنگی جہاز نے اُس کو اور اُس کے بیٹے پرنس آندرے کو وہاں سے نکالا تھا) پرنس آندرے، پرنسز اولگا کے والد تھے، پرنسز اولگا ابھی زِندہ ہیں اور لندن کے علاقے کینٹ میں رہتی ہیں۔ وُہ کہتی ہیں کہ زار نکولس ہمیشہ برطانوی وزیر اعظم کو قُصوروار سمجھتے رہے کہ اُس نے اسائلم کی اجازت نہیں دِی تھی لیکن اصل میں تو یہ جارج پنجم کا آئیڈیا تھا۔ پرنس اولگا مزید کہتی ہیں کہ چلو اچھا ہُوا زار یہ جاننے سے پہلے گُزر گئے ورنہ اُن کو بُہت زیادہ دُکھ ہوتا، بہر حال جارج کے سنگدلانہ انکار نے اپریل 1917 میں بین الاقوامی بادشاہت کے کلب کا خاتمہ کر دیا۔

لارڈ سٹیمفورڈھم نے کنگ جارج اور کوئین میری کو عوام میں گُھلنے مِلنے کا مشورہ دِیا کیونکہ پہلی جنگِ عظیم میں جب لندن کے شہریوں کا بالخصوص اور انگلینڈ کے شہریوں کا بالعموم رویہ شاہی خاندان سے ناراض ناراض سا تھا اور ممکن تھا کہ یہ ناراضگی بغاوت تک چلی جاتی تو ایسے حالات میں شاہی خاندان کا اِس طرح لوگوں میں گھلنے ملنے سے بڑا اچھا اور مثبت اثر ہوسکتا تھا۔ 1917 کے بہار کے موسم میں پرنس اوو ویلز اور مستقبل کے بادشاہ ایڈورڈ ہشتم بھی اگلے مورچوں پر اپنی افواج کے ساتھ اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے اور وُہ اپنے لوگوں میں کافی زیادہ پسند بھی کیے جاتے تھے۔ دُوسرا بیٹا پرنس برٹی بھی نیوی میں خدمات سرانجام دے رہا تھا پرنس برٹی موجودہ ملکہ الیزبیتھ دوئم کے والد تھے۔ پرنس برٹی تھوڑا ہکلاتا تھا اور اُسے نی نو کنگ کا مسئلہ بھی تھا۔

بہر حال ابھی برطانوی شاہی خاندان کو اپنے لئے ایک نئے نام کی تلاش تھی اور بادشاہ کے پرائیویٹ سیکریٹری لارڈ سٹیمفورڈھم سوچ سوچ کر تھک چکے تھے۔ جو نام ابھی چل رہا تھا یعنی سیکس کوبرگ گوتھا/گوٹا، یہ نام ملکہ وکٹوریہ کے جرمن شوہر پرنس البرٹ نے رکھا تھا اور اب اِس نام کے ساتھ مزید چلنا نا مُمکن تھا۔ کئی نام سوچے گئے جیسے کہ Tudor، Stuart، Fitzroy وغیرہ لیکن سب کے سب نام اچھا تاثر نہیں دے رہے۔ لارڈ سٹیمفورڈھم اِس ضمن میں کافی پریشان تھا۔ 13 جون 1917 کو جرمن طیاروں نے لندن پر پھر بمباری کی اور اُسی دِن ونڈسر کاسل کی کھڑکی میں کھڑے کھڑے اُسے یہ نام ذہن میں آیا۔

اب یہ برطانوی شاہی خاندان کا نیا نام تھا اور اب برطانوی بادشاہت اِس نام کے ساتھ آگے چلنی تھی۔ یہ نام انگریزی تھا اور اِس سے اجنبیت کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ کنگ جارج نے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کا اِس نام والے مسئلے کو حل کرنے پر بُہت شُکریہ بھی ادا کیا اور تعریفی خط بھی لکھا۔

11 نومبر 1918 میں پہلی جنگِ عظیم ختم ہوگئی۔ اِس جنگ میں دس لاکھ کے قریب برطانوی افراد مارے گئے تھے۔ یورپ میں نو کے قریب بادشاہ اپنے تخت سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے جن میں کنگ جارج کے جرمن اور رشین کزنز بھی شامل تھے۔ لیکن لندن میں بادشاہ اور شاہی خاندان کو اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پرنس برٹی اور الیزبتھ کی شادی ویسٹ منسٹر ایبی میں 26 اپریل 1923 میں ہُوئی تھی جبکہ اکتالیس سالہ کنگ ایڈورڈ ہشتم جو اپنے والد جارج پنجم کی وفات کے بعد بادشاہ بنے وُہ ابھی تک غیر شادی شُدہ تھے۔

1934 میں ایک امریکن خاتون والس سمپسن جو دو بار طلاق یافتہ تھی اُس کے ساتھ کنگ ایڈورڈ کا افیئر چلا لیکن اُس وقت کے حساب سے بادشاہ ایک مطلقہ عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا تو بادشاہ نے ولیس سمپسن کی خاطر 10 دسمبر 1936 کو اپنی مرضی سے تاجِ برطانیہ چھوڑ دیا۔ اِس وجہ سے اب پرنس برٹی کو برطانیہ کا نیا بادشاہ مقرر کیا گیا۔ برٹی نے اپنے والد کے نام کی مُناسبت سے اپنا ٹائٹل جارج ششم رکھا۔ موجودہ ملکہ الیزبیتھ دوئم جارج ششم کی ہی بیٹی ہیں جو 2 جون 1953 کو ملکہ برطانیہ بنیں اور ابھی تک ہیں۔ ملکہ برطانیہ کامن ویلتھ ممالک کی بھی ملکہ ہیں اور اُن کی عزت پُوری دُنیا میں کی جاتی ہے۔

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لئے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جا رہا ہے۔

امریکا میں ''اوسلو''

تحریر زرتشت منیر احمد

اوسلو ناروے کا دارالحکومت ہے لیکن اسی نام کے شہر امریکہ میں بھی پائے جاتے ہیں ہم نے ایک خط لکھا اور پوسٹ کیا ۔ایڈریس کے ساتھ اوسلو تو لکھا لیکن ناروے لکھنا بھول گئے۔شکر ہے کہ لفافے کی پشت پر اپنا ایڈریس لکھا تھا لہذا دو ماہ کے بعد یہ خط طویل سفر کر کے سارے امریکہ کی سیر کرتے ہوئے واپس پہنچ گیا بہت حیرانگی ہوئی جب معلوم کیا تو پتہ لگا کہ اوسلو صرف ہمارا دارالحکومت ہی نہیں بلکہ اسی نام کے تین شہر امریکہ کی ریاست مینی سوٹا اور فلوریڈا میں بھی واقع ہیں

ایک وقت تھا کہ پاکستان میں لوگ غربت سے تنگ آ کر اپنی جائداد فروخت کر کے دوبئی یا متحدہ امارات کا رُخ کیا کرتے تھے تا کہ زندگی کے دن آسودگی سے گزار سکیں بعض ایجنٹوں کے ہتھے چڑھ جاتے تھے جو انہیں رات بھر کشتی میں سمندر کی لہروں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے گوادر کے قریب ساحلِ سمندر پر اتار دیتے اور بتاتے کہ وہ سامنے دوبئی کی روشنیاں ہیں چلے جاؤ اُن دنوں پاکستان میں ٹی وی ڈرامہ ''دوبئی چلو'' بہت دلچسپی سے دیکھا جاتا تھا۔

یہی حال یہاں ناروے میں تھا انیسویں اور بیسویں صدی میں یہاں غربت اور موسم کی سختی کی وجہ سے بہت کثرت سے نارویجن لوگوں نے اپنی جائدادیں وغیرہ فروخت کر کے امریکہ کا رُخ کیا۔

امریکہ میں زیادہ تر یہ لوگ ریاست مینی سوٹا میں آباد ہوئے وہاں سویڈن ڈنمارک، فرانس اور جرمنی کے مہاجرین آباد ہونے کی وجہ سے یوروپین و امریکن کلچر میں ضم ہونے میں کوئی دشواری پیش نہ ہوئی۔

اوسلو ریاست منی سوٹا کی کاؤنٹی ''مارشل'' میں واقع ہے اگر سڑک انٹر اسٹیٹ نمبر 29 پر ڈرائیو کریں تو مشرق کی طرف تین میل کے فاصلہ پر اوسلو واقع ہے چھوٹا سا قصبہ ہے اوسلو کے مغرب میں دریائے احمر شمالی (Red river of the north) بہتا ہے 2010 کے سروے کے مطابق یہاں کی کل آبادی 350 تھی۔

پوسٹ آفس:

اینڈریو ھلڈن نامی ایک شخص 1853 میں ناروے میں پیدا ہوا 1869 میں امریکہ ہجرت کر گیا 1897 میں اس نے ایک اسٹور کھولا اور 1905 میں اسی سٹور کے ساتھ ہی پوسٹ آفس قائم کیا یہ پوسٹ آفس ''اوسلو'' کے نام سے موسوم ہوا

(ریاست منی سوٹا)

Minnesota

منی سوٹا کو دس ہزار جھیلوں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے یہاں گلیشیئر ز اور برفباری کے باعث پانی اور جھیلوں کی کثرت ہے زمین بہت زرخیز ہے جنگلات بھی بہت پائے جاتے ہیں شکاریوں کے لئے نہایت موزوں جگہ ہے

یہ بتیسویں ریاست تھی جس نے 11 مئی 1858 میں ریاستہا متحدہ امریکہ سے الحاق کیا تھا مالی لحاظ سے بہت مضبوط ریاست ہے عوام کی زیادہ تعداد خواندہ ہے دنیا کی سب سے قدیم چٹانیں یہاں کے کوہساروں میں مشاہدہ کی جاسکتی ہیں اس ریاست کی سرحد شمال میں کینیڈا کے صوبہ انٹاریو سے ملتی ہے ریاست کا نام منی سوٹا دریا کے نام پر ہے جس کا مطلب ہے ''صاف نیلا پانی''

دوسرا ''اوسلو'' کہاں واقعہ ہے

اسی ریاست کی ڈاج کاؤنٹی میں واقع ہے جبکہ تیسرا ''اوسلو''۔ ریاست فلوریڈا کی انڈین ریور کاؤنٹی کے جنوب مشرق میں واقع ہے یہاں نارویجن 1883 میں آباد ہوا اور وطن کی محبت اور یاد کو تازہ رکھنے کی غرض سے اس قصبہ کو 'اوسلو' کا نام دے دیا۔

سو یاد رکھیں کہ آپ جب بھی ہمیں لکھیں تو خط پر پتہ لکھتے ہو 'اوسلو' کے ساتھ ملک کا نام 'ناروے' ضرور لکھیں ورنہ خط امریکہ کی سیر بھی کر سکتا ہے۔

شعبہ انٹرنیشنل

جوا، شراب اور ویڈیو گیمز: انسان کو کسی چیز کی لت کیوں اور کیسے لگتی ہے؟

برطانیہ میں نیشنل ہیلتھ سروس رواں برس جوئے کی لت کے شکار نوجوان افراد کے لیے اپنا پہلا کلینک کھول رہی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جوئے میں ایسا کیا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو اس کی لت لگ جاتی ہے۔

نیشنل پرابلم گیمبلنگ کلینک نامی اس ادارے کے ذریعے 13 سے 25 سال کی عمر کے لوگوں کی مدد کی جائے گی۔

لیکن آخر جوا کھیلنے میں ایسا کیا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو اس کی لت لگ جاتی ہے اور اس کے حل کے لیے لوگوں کو کیا کرنا چاہیے؟

یہ جاننے کے لیے ہمیں پرانے وقتوں پر نظر ڈالنی پڑے گی جب انسان جانوروں کا شکار یا پہلے سے موجود خوراک اکٹھی کیا کرتے تھے، اور ہمارا واحد کام زندہ رہنا تھا۔

لندن کے نائٹنگیل ہسپتال میں مختلف لتوں کا علاج کرنے والے ماہر ڈاکٹر سائرس اباسیئن کا کہنا ہے کہ 'آسان لفظوں میں اسے ایسے سمجھایا جا سکتا ہے کہ ہمارا دماغ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ انعام کا متلاشی رہتا ہے۔'

ان کے مطابق یہ انعام دماغ میں ڈوپمین نامی ایک کیمیکل کی شکل میں ملتا ہے جو ہمیں خوشگوار احساس دیتا ہے۔

جوا کھیلنے سے دماغ کے اس حصے پر اثر پڑتا ہے جو ارتقائی پہلو سے دیکھا جائے تو کم جدید ہے اور جو زیادہ تر فوری طور پر ملنے والے فائدے کی طرف مائل ہوتا ہے۔'

پرانے وقتوں میں ایک بڑے جانور کے شکار سے ہمیں جذباتی خوشی ملتی تھی، اور اس کی مدد سے ہم پورے خاندان کے کھانے کا بندوبست کر سکتے تھے۔'

ڈاکٹر اباسیئن کے مطابق شراب، منشیات یا جوئے کی لت کی وجہ سے جزا کا یہ نظام خراب ہو جاتا ہے۔

ہم اب بہت مصنوعی ماحول میں رہتے ہیں۔ ہم کاریں چلانے یا جہاز اور ٹرین پر سفر کرنے کے لیے نہیں بنے ہوئے۔'

دماغ کا وہ پرانا حصہ ابھی بھی وہیں موجود ہے اور زیادہ سوچے سمجھے بغیر فوراً ملنے والے انعام کی سوچ بھی وہیں موجود ہے اور شراب، تمباکو، جوے یا گیمنگ سے منسلک کمپنیاں اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں۔'

اسی طرح جب ہم جوئے میں جیتتے ہیں تو ہمارے دماغ کو وہی جذباتی خوشی یا انعام ملتا ہے۔

کئی لوگ ڈوپمین کا خوشگوار احساس حاصل کرنے کے بعد اپنی زندگیوں میں واپس چلے جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسا نہیں کر پاتے۔

جب لوگوں کو جوئے کی لت لگ جاتی ہے تو ان کے لیے معمول کی چیزیں خوشی کا باعث نہیں بنتیں اور پھر وہ اس خوشگوار احساس کے لیے جوا کھیلتے ہیں۔ یہ خوشگوار احساس ہم جیسے عام لوگوں کو قدرتی طور پر میسر ہوتا ہے۔'

اور کیونکہ یہ دماغی عمل ہے اس لیے لت لگنا ایک خاندانی رویہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں جینیاتی عمل دخل بھی ہوتا ہے۔ کچھ لوگ جینیاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے فوری طور پر ملنے والی خوشی کو ترجیح دیتے ہیں۔'

یہ جان بوجھ کر کیا جاتا ہے'

29 سالہ جیمز گرائمز نے اپنی زندگی کی ایک دہائی جوئے کی لت میں گزاری ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر اباسیئن کی وضاحت سے مکمل اتفاق کیا۔

آپ وقتی طور پر ملنے والے زبردست احساس اور توانائی میں کھو جاتے ہیں۔ میں کبھی کبھار اسے جسمانی تجربے سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ یہ تمام عقلی اور منطقی فیصلہ سازی سے ماورا ہے۔'

ان کے مطابق 'ہار کبھی بھی اتنی بری نہیں لگتی جتنا مزاجیت سے ملتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جوئے کے کاروبار سے منسلک کمپنیاں یہ جان بوجھ کر کرتی ہیں۔

انھیں ایسے نفسیاتی طریقے معلوم ہیں جن سے وہ کمزور لوگوں کو نشانہ بناتے ہیں۔'

برطانیہ میں جوئے کے کاروبار کی نگرانی کرنے والی گیمبلنگ کمیشن نے کہا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ لوگوں کی مدد اور علاج کے لیے سہولیات آسانی سے میسر ہوں۔

(بشکریہ بی بی سی اردو)

صحیح مذہب اور صحیح سائنس کا ٹکراؤ ممکن نہیں

تحریر ابن قدسی

حدیث میں ہے کہ علم کی دو اقسام ہیں ایک علم الادیان اور دوسرا علم الابدان ہیں ۔ایک مذہب کا علم ہے جس کی بنیاد الہام پر ہے اور دوسرا علم جسموں کا یعنی دنیا میں پائی جانے والی مادی اشیاء کے مطالعہ اور تحقیق سے حاصل ہونے والا علم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام مخلوقات کو پیدا کیا اور انہیں ایک صورت دی۔ایک ہیت دی۔جو ظاہری آنکھ سے نظر آتی ہے۔ان مخلوقات میں بے شمار خصوصیات اور خوبیاں رکھیں۔ان کے لیے قاعدے اور قانون بنائے۔انسان کو پیدا کیا اور اس کے اندر بے شمار نظاموں کو جمع کر دیا۔آنکھ بنائی تو اس کا ایک باقاعدہ نظام ہے۔کس طرح آنکھ دیکھتی ہے۔کس طرح ذہن آنکھ سے نظر آنے والی چیز کو پہچانتا ہے۔کارنیا یا دیگر آنکھ کے نظام میں شامل اعضاء کو پیدا کیا۔ہر عضو کے ذمہ ایک کام لگا دیا اور وہ اسی کے مطابق کام کیے جاتے ہیں۔جس سے بحیثیت مجموعی آنکھ اپنا دیکھنے کا کام کرتی ہے۔اسی طرح تمام اعضاء کو خدا تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے۔دنیا میں کسی کا یہ دعویٰ نہیں کہ اس نے اپنے اعضاء خود بنائے ہیں یا کسی سائنسدان نے اسے دیئے ہیں۔بلکہ اس کی تخلیق کے ساتھ ہی اسے یہ تمام اعضاء مل گئے ہیں۔اب میڈیکل سائنس یہ شور مچاتی ہے کہ اس نے بڑی ترقی کر لی ہے۔اِس چیز کا علاج دریافت کر لیا اس بیماری کا علاج دریافت کر لیا۔اُس علاج سے کس حد تک فائدہ ہوا یہ ایک الگ بحث ہے لیکن سوال تو یہ کہ اس عضو کی تخلیق اور اس کی خصوصیات کس نے پیدا کیں۔دنیا کا بڑے سے بڑا اسپیشلسٹ اس عضو کا مطالعہ کر کے اس کی خوبیوں اور خواص کو جان کر اس میں پیدا ہونے والی خرابی کے بارے میں علم حاصل کر کے اپنے آپ کو اس کا سپیشلسٹ کہلانا شروع کر دیتا ہے۔یہ ہے سائنس کی معراج۔کبھی اس خالق کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے جس کی مخلوقات کے بارے میں علم حاصل کر کے سائنسدان بن کر اپنے آپ کو اس خالق کے مقابل کھڑا کر لیتے ہیں۔یہ تو ایک انسان اور اس میں سے اس کی آنکھ کی مثال دی ہے۔باقی اعضاء اور اسی طرح کائنات میں پائی جانے والی کھربوں مخلوقات اپنی اپنی خوبیوں اور خواص کے ساتھ ایک خالق کی طرف راہنمائی کرتیں ہیں۔

گویا جتنا علم حاصل کرتے چلے جائیں گے اتنا ہی اپنی کمزوری کا احساس بڑھتا چلا جائے گا اور خالق کی خالقیت پر ایمان زیادہ ہوتا چلا جائے گا۔اس سے پتا چلا کہ صحیح علم انسان میں عاجزی انکساری پیدا کرتا ہے اور اسے اس کے عقیدہ میں مضبوطی دیتا ہے۔

اس کائنات کی تخلیق مادہ کے ساتھ اور قوانین کے مطابق ہوئی ہے۔مادہ یا جسم نظر آتا ہے اس لیے ہم اس کے بارے میں بآسانی علم حاصل کر لیتے ہیں۔تجربہ اور مشاہدہ ہمارے علم میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔یہ اضافہ اس پر ہماری دسترس کو یقینی بناتا ہے اور سمجھا جاتا ہے بہت ترقی کر لی۔حالانکہ غور کیا جائے تو یہ ترقی اصل میں قوانین قدرت کے مطالعہ ہو کہا جا رہا ہوتا ہے۔قوانین قدرت بنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔جتنا زیادہ مطالعہ اتنی زیادہ ترقی۔

ایک تو یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے قوانین قدرت۔دوسرا ہے قانون شریعت۔اللہ تعالیٰ نے آنکھ بنائی وہ کس طرح کام کرتی ہے۔ان قوانین قدرت کا مطالعہ کر کے جان لیا جاتا ہے۔اس آنکھ کا کام ہی دیکھنا ہے لیکن کیا اس آنکھ پر کوئی پابندی بھی ہے۔ ایک چیز انسان کو ملی ہے وہ مالک سمجھ کر اس کو جیسے مرضی استعمال کرنا اپنا حق سمجھتا ہے حالانکہ اس کی تخلیق میں اس کا ذرا برابر حصہ نہیں۔

ایک چیز قدرتی طور پر مل جانا مالک بنا دیتا ہے تو جس خالق نے ہمیں تخلیق کیا ہے اس کا ہم پر قانونی حق بہت زیادہ ہے۔تو اس حقیقی مالک نے آزادی دی ہے کہ جو مرضی دیکھو یا کچھ پابندی لگائی ہے۔اس نے صرف اتنا ہی کہا ہے کہ بعض چیزوں کو دیکھتے ہوئے احتیاط کرلو۔غض بصر سے کام لو۔وہ کام جو ذہنی انتشار کا باعث بنتے ہیں اور انسان کو گناہ کی طرف لے جاتے ہیں ان مواقع پر نظر کے استعمال میں احتیاط کرو۔ان قوانین کا نام قوانین شریعت ہیں۔جس کو مذہب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ان قوانین پر عمل کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ جزا دیتا ہے اور نافرمانی کی صورت میں سزا دیتا ہے۔اب جن باتوں میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس پر عمل ضروری ہے اور جس سے منع کیا ہے اس سے رک جانا یہی مذہب اور یہی شریعت ہے۔پس قانون قدرت تو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور قانون شریعت اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔اللہ تعالیٰ کے فعل اور قول میں کوئی تضاد نہیں ہوسکتا۔

سائنس اللہ تعالیٰ کے فعل کے مطالعہ کا نام ہے اور مذہب اللہ تعالیٰ کے قول کے مطالعہ اور اس پر عمل کا نام ہے۔فعل بظاہر نظر آ رہا ہوتا ہے اور تجربہ اور مشاہدہ سے اس کے بارے میں آگاہی نسبتاً آسان ہے اس لیے سائنس کے بارے میں کہا

جاتا ہے یہ سب سے صحیح علم ہے اور اس کے مقابل پر مذہب کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ سائنس نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جتنی تبدیلیاں اپنے اندر کی ہیں کسی اور چیز نے نہیں کیں۔ تجربہ اور مشاہدہ میں جتنی ترقی ہوتی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ سائنس میں تبدیلیاں آتی جاتی ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس کا علم حتمی اور یقینی ہے۔ ایک وقت میں سائنس یہ کہتی تھی کہ زمین چپٹی ہے پھر سائنس نے کہا کہ زمین گول ہے۔ کبھی کہا دنیا میں چار طاقتیں اور قوتیں کام کرتی ہیں اور کبھی کہا تین کرتی ہیں۔ صرف ان حقائق کے متعلق سائنس کی رائے حتمی ہوتی ہے جس کے بارے میں تجربہ اور مشاہدہ یقینی گواہی دے دے۔ لیکن تجربہ اور مشاہدہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ بدل رہا ہے۔ پہلے زمانے میں مشاہدہ بہت محدود تھا اب دوربین اور خوردبین سے مشاہدہ بہت لطیف ہو چکا ہے جس سے نئے نئے حقائق سامنے آ رہے ہیں۔ اس لیے کسی چیز کے متعلق ہمارا علم اور ہماری سائنس سو فیصد حتمی نہیں ہے۔ ایک چیز کے متعلق کوئی رائے حتمی ہوتی ہے لیکن بعد میں نئے نئے حقائق متعارف ہوتے ہیں۔ جب ایٹم دریافت ہوا تو سمجھا گیا کہ اب سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی اس سے اوجھل نہیں۔ لیکن ایٹم کے مطالعہ نے ہی بتایا کہ اس سے آگے اور بھی جہان ہیں۔ ہمارے نظام شمسی کے مطالعہ نے بتایا کہ کہکشاں کیا ہے لیکن کہکشاں کے مطالعہ نے بتایا کہ کائنات میں ہماری زمین کی حیثیت ایک ذرہ کے برابر بھی نہیں۔

سائنس تو نام ہی ہے ترقی کا۔ مطالعہ کرتے جائیں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

اب آتے ہیں قانون شریعت کی طرف۔ شریعت اللہ تعالیٰ کے کلام پر مبنی ہوتی ہے جو قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔ اس میں تبدیلی اللہ کے کلام کے ذریعہ ہی ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی چیز کے متعلق بتا دیا جائے تو وہ تبدیل نہیں ہوتا۔ خاص طور پر قانون قدرت کے متعلق کوئی چیز بتائی جائے تو وہ تبدیل نہیں ہوتی۔ خواہ ہمارے تجربہ اور مشاہدہ اس کے متعلق فی الحال قطعی اور یقینی نہ ہو۔ یہ مضمون اتنا لمبا ہے کہ اس لیے بہت زیادہ وقت درکار ہے۔ صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ابھی تک تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ جو سائنس قطعی اور یقینی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے صحیح کلام یعنی قرآن کریم کے خلاف نہیں ہے۔

لیکن ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہم مذہب اور سائنس میں بظاہر کوئی تضاد دیکھتے ہیں تو غیر مذہبی سائنس اور مذہبی مذہب کو ترجیح اور فوقیت دیتے نظر آئیں گے۔ اور فریقین مذہب اور سائنس کو دشمن قرار دیتے ہیں۔ یہ رویہ مذہبی لوگوں اور غیر مذہبی لوگوں دونوں طرف سے سامنے آتا ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سائنس جس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہوتی ہے اس میں بھی اختلاف نظر آتا ہے۔ صرف ایک میڈیکل فیلڈ میں ہی ابھی تک بے شمار تبدیلیاں ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ حالانکہ پوری دنیا میں شاید اس میڈیکل کے شعبہ میں سب سے زیادہ تجربات ہوتے ہیں۔ ایک انسانی جسم ہی ہے جس میں پایا جانا والا نظام دنیا کے ہر کنارے میں پائے جانے والے انسان میں ایک جیسا ہے۔ جو تجربہ ایک کنارے پر ہوتا ہے اس کی بنیاد پر حاصل ہونے والے نتائج پر دوسرے کنارے پر رہنے والے شخص کا بھی علاج کیا جاتا ہے۔ اس قدر وسیع تجربات کے باوجود بیماریوں کے علاج میں اختلاف ہوجاتا ہے۔ بیمار شخص کوشش کرتا ہے کسی اچھے ماہر ڈاکٹر سے علاج کروائے۔ اگر سائنس اپنی بنیادیں مضبوط رکھتی ہے تو کیوں سارے ڈاکٹر ایک جیسا علم اور مہارت نہیں رکھتے۔ کیوں ہم کسی عام ڈاکٹر سے علاج نہیں کرواتے بلکہ کوشش کرتے ہیں کسی سپیشلسٹ کو تلاش کرتے ہیں۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ بے شک سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں حتمی نتائج سے آگاہ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی جس کا علم زیادہ ہوگا جس کا تجربہ زیادہ ہوگا وہی صحیح علاج اور صحیح راہنمائی کر سکتا ہے۔ اگر علاج ہوجائے تو ٹھیک اور اگر علاج نہیں ہوتا تو کوئی بھی سائنس کو برا بھلا نہیں کہتا یا سائنس کا قصور نہیں نکالتا۔ لیکن مذہب کے معاملہ میں ہم اپنی اس روش کو تبدیل کر لیتے ہیں۔ کسی بھی مذہبی مسئلہ میں کسی بھی عالم دین کو دین کا عالم سمجھ لیتے ہیں اور اس کی کہی ہوئی بات کو بحیثیت مجموعی مذہب کی طرف منسوب کر کے مذہب کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں اگر وہ بات ہمیں بری لگتی ہے۔ ہم یہ کوشش ہی نہیں کرتے کہ ہم کسی ایسے سپیشلسٹ کو تلاش کریں جو ہماری صحیح راہنمائی کر سکے۔ بغیر سوچے سمجھے مذہب کو ہی برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

سائنس کے حوالے سے اختلاف سامنے آئے تو سائنسدانوں کا قصور لیکن مذہب کے معاملے میں مذہب ہی برا بنتا ہے۔ سائنس کے حوالے سے یہ اصول ہے، جس کا علم زیادہ وہ صحیح سائنس دان حالانکہ حتمی وہ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن مذہب کے معاملے میں کوئی بھی مولوی کچھ بھی کرے مذہب کے حوالے سے وہ حتمی بن جاتا ہے اور بدنام مذہب ہوتا ہے۔ مذہب اور سائنس کی لڑائی شروع ہوجاتی ہے۔ حالانکہ صحیح سائنس اور صحیح مذہب میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔

مسجد کے امام اور استغفار پسند عوام

تحریر عفت نوید

مسجدیں بنانے کی اپیل کرنے والوں کو چندہ با آسانی مل جاتا ہے۔اوران مسجدوں میں امام کی نوکری اور متصل کمرے میں رہائش بھی آسانی سے مل جاتی ہے۔ یہ نوکری کوئی اہم کام بھی نہیں۔اس نوکری پر رہتے ہوئے آپ کافی سارے کام ایک ساتھ کر سکتے ہیں، ننھے بچوں کو پڑھایئے، پیسے کمایئے۔نکاح کروایئے۔ پیسے کمایئے۔

ان سارے نیک کاموں کے عوض پڑوس کے گھروں سے اللہ کو راضی کرنے کے لیے کھانا بھی پہنچا دیا جاتا ہے۔اور محلے میں بے حساب عزت۔امام مسجد کی آمدنی بہت زیادہ تو نہیں پھر بھی کسی محنت کش مزدور سے اچھی ہوتی ہے۔اگر امام کی دینی معلومات کم بھی ہیں تو فکر کی کوئی بات نہیں۔خواتین کی بے حیائی کو بے نقاب کرنے کے لیے مطالعے کی نہیں آنکھوں اور زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ اسلام کے نام پر بننے والے ملک میں ہر تباہی کا ذمہ دار عورت کو ٹھہرایا جائے، پھر احادیث کی روشنی میں عورت کو قابو میں رکھنے کے شرعی طریقے بتائے جائیں۔مسجد میں سامعین سارے مرد ہوتے ہیں بات ان کے مطلب کی ہے، کون سوال اٹھائے گا۔

اس کے بعد ذرا اللہ کی رحمتوں کا بیان دیں، جنت کا منظر پیش کریں۔دوزخ کے عذاب سے ڈرائیں اور اختتام پر اللہ کے غفور الرحیم ہونے کو ثابت کرنے کے لیے یہ کہہ کر ڈرے ہوئے مومنین کو تسلی دیں کہ اللہ کو توبہ اور استغفار بہت پسند ہے، اللہ رب العزت نے جنت مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دی ہے جلد مسلمان ہونے کے ناتے جنت ملے گی مسلمان ہی کو۔

امامِ مسجد کا وعظ سننے والوں میں بڑے بڑے افسر، ٹیچر، ڈاکٹر، دکان دار سب ہی موجود ہوتے ہیں۔جن میں سے کچھ کی دینی اور دنیاوی تعلیم ہر اعتبار سے اس سے زیادہ ہوتی ہے، لیکن اختلاف نہ کرنے کی دو وجوہات ہو تی ہیں ایک تو جان کا خوف اور دوسرے واعظ کی بتائی ساری باتیں ان کے حق میں ہیں ضرورت کیا ہے پنگا لینے کی۔

اب تک جن بچوں کے ساتھ زیادتی کے بعد قتل ہوا ہے ان سب بچوں کے والدین، نمازی پرہیز گار اور اللہ کے شکر گزار بندے ہیں اور جنہوں نے بچوں کے ساتھ زیادتی کی وہ بھی صوم وصلواۃ کے پابند اور رب سے استغفار کرنے والوں میں سے تھے۔

ہمارے اسلامی معاشرے میں مجرم استغفار کی امید اور معاشرے کی (عورتوں کی بے حیائی کی توجیح) تھپکی پر کوئی ندامت محسوس نہیں کرتا۔اسے پھانسی کی سزا بھی سنا دی جائے تو وہ جیل میں استغفار کرتا رہتا ہے۔خواہ اس مظلوم بچی کے والدین کے سینے میں اس کی سخت سے سخت سزا کی خواہش ہو۔ پڑھا اور سنا ہے کہ رب تب ہی معاف کرتا ہے جب بندہ معاف کرے، لیکن امام کی نظر میں اسلامی تعلیم کی شانِ عظیم اسی بیان میں ہے کہ اللہ غفور ہے، اس کا در توبہ کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا ہے، توبہ، استغفار سے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

کیا یہ ایسے ہی بیانات کا اثر ہے کہ وحشی درندے ننھی سی بچی پر رحم نہیں کھاتے اور بے دردی سے اسے بھنبھوڑ ڈالتے ہیں۔وہ اسے تشدد کر کے مار ڈالیں، اسے ویرانے میں پھینک دیں، بچی کے مسلمان والدین پر رحم نہ کھائیں جو بچی کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اس کی تلاش میں بھٹکتے اور تڑپتے رہیں گے، اور مطمئن رہیں کہ اللہ معاف کر دے گا۔والدین بھی اپنے بچوں کی حفاظت کو خود یقینی بنانے کی بجائے اس توکل پر بیٹھے رہیں گے کہ اللہ انہیں محفوظ رکھے گا۔

کافروں کے ممالک میں جہاں عورت ننگی گھومتی ہے، وہاں بچوں سے زیادتی کے جرائم اکا دکا ہی ہوتے ہیں، کیوں کہ انہیں یقین ہے کہ وہ اپنی عبادات میں سچے دل سے کتنی ہی توبہ کر لیں، انہیں قانون کے مطابق دنیا ہی میں سخت سزا ملے گی۔تعلقات، عہدہ، اختیار اور پیسہ کچھ کام نہ آئے گا۔معاشرہ اور مولوی ایسے مجرم کو کوئی معافی نہیں دیتا۔وہاں ایسے مجرم کو جیل سے بری ہونے کے بعد بھی اتنی حقارت سے دیکھا جاتا ہے کہ اسے خود سے نفرت محسوس ہونے لگتی ہے اور کبھی کبھار ایسے مجرم خودکشی تک کر لیتے ہیں۔

دعا ہے کہ استغفار پسند عوام کے بچے ان استغفار پسند مجرموں سے محفوظ رہیں۔

کتاب اور دنیا برتنے کا فن

تحریر غازی صلاح الدین

امریکی سیاست دان نیوٹ گنگرچ جب 1994ء میں ایوانِ نمائندگان کے اسپیکر منتخب ہوئے تو انہوں نے اپنی ری پبلکن پارٹی کے ارکان کیلئے سات کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی اور ہدایت کی کہ جب ارکان اجلاس میں شرکت کیلئے آئیں تو یہ تمام کتابیں پڑھ کر آئیں۔ ان سات کتابوں میں امریکہ کی تاریخ اور معاشرے کے علاوہ افسانوی ادب کے دو شاہکار بھی شامل تھے۔ دونوں سے آپ شاید واقف ہوں۔ ایک تو ''گون ود دا ونڈ'' کہ جس پر مبنی 1939 کی ہالی وڈ فلم نے سینما کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور دوسرا ناول وہ جس کا ذکر ہماری حالیہ سیاسی تاریخ میں کیا جا چکا ہے۔ میں ''گاڈ فادر'' کی بات کر رہا ہوں۔ موجودہ چیف جسٹس جناب آصف سعید کھوسہ نے نواز شریف سے متعلق اپنے ایک فیصلے میں ''گاڈ فادر'' میں شامل ایک مقولے کا حوالہ دیا تھا۔ نکتہ کچھ یہ تھا کہ ہر بڑی جائیداد یا دولت کے پردے میں کوئی جرم چھپا ہوتا ہے۔ ''گاڈ فادر'' اور سسلی کے مافیا کی ایک اور بازگشت بھی اعلیٰ عدالت میں سنی گئی تھی۔ جسٹس کھوسہ کا مزید ذکر ابھی آئے گا۔ یہاں میں صرف اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں کہ ان سیاست دانوں کیلئے جن پر قانون سازی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیوں یہ بہت ضروری ہے کہ وہ تاریخ اور ادب اور دوسرے علوم سے خاطر خواہ حد تک واقف ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ صلاحیت صرف سیاست دانوں کیلئے ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں قائدانہ کردار ادا کرنے والے افراد کیلئے بھی لازمی ہے۔ بل گیٹس ہر سال ان کتابوں کی ایک فہرست مرتب کرتے ہیں جنہیں انکے خیال میں سب کو پڑھنا چاہئے۔

اس تناظر میں اگر ہم اپنی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کی اجتماعی علمی اور فکری استعداد کا جائزہ لیں تو پتا نہیں کیسی تصویر بنے گی۔ جب میں ''جیو کتاب'' کا پروگرام کر رہا تھا تو نیوٹ گنگرچ کو یاد کر کے میں نے سوچا کہ کراچی یونیورسٹی کے تمام اساتذہ کے مشورے سے میں بھی ایسی سات کتابوں کی فہرست بناؤں کہ جنہیں ہمارے منتخب سیاست دان ضرور پڑھیں۔ یہ منصوبہ کئی وجوہات کے سبب مکمل نہ ہو سکا، ایک دوست نے تو یہ چٹکی بھی لی کہ کیا تمہیں یقین ہے کہ ہر استاد نے ایسی سات کتابیں خود بھی پڑھ رکھی ہوں گی۔ پھر بھی، میرا جی چاہتا ہے کہ اس تجویز پر عمل کیا جائے کیونکہ ایوانوں میں اور ٹیلی وژن کے ٹاک شوز میں جس قسم کی گفتگو کی جاتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیاست دانوں میں سے کئی کتابوں سے مسلسل پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن وہی بات، بعض دانشور جوان کے ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں ان کی گفتگو سن کر بھی کسی کے علم اور معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ مطلب یہ کہ ہمارے معاشرے میں مطالعے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس اخبار میں اپنے ابتدائی کالموں میں سے ایک میں میں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ اگر ہم کسی امیر علاقے کے ہر دروازے یعنی گیٹ پر گھنٹی بجا کر یہ پوچھیں کہ کیا آپ کے گھر میں ''دیوانِ غالب'' ہے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ جہاں تک اس مشورے کا تعلق ہے کہ کس کو کون سی کتاب پڑھنا چاہئے تو میں بتاؤں کہ ''نیو یارک ٹائمز'' میں ہر ہفتے کسی ادیب یا دانشور کا جو انٹرویو شائع ہوتا ہے کتابوں کے بارے میں تو اس میں اب یہ سوال شامل ہوتا ہے کہ کسی ایک ایسی کتاب کا نام بتائیں جو آپ کے خیال میں صدر ٹرمپ کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ اس بات کا امریکیوں کو بہت دکھ ہے کہ ان کا موجودہ صدر کتابیں نہیں پڑھتا۔ اس مرحلے پر مجھے خود کو ذوالفقار علی بھٹو کے ذکر سے روکنا پڑے گا کیونکہ کتابوں سے ان کے عشق کی کہانی طویل ہے۔ ابھی جمعرات کو ہم نے بھٹو کی چالیسویں برسی منائی اور سارے منظر پر آصف زرداری اور بلاول بھٹو زرداری چھائے رہے۔ اچھا، اب میں آپ کو یہ بتاؤں کہ میں نے اس ہفتے اس موضوع کا انتخاب کیوں کیا ہے اور سیاسی گرما گرمی اور معیشت کی ابتری سے پیدا ہونے والی چپقلش کو چھوڑ کر کتابوں کی بات کیوں کر رہا ہوں اور ہاں، جسٹس کھوسہ کا نام بھی میرے اس بیان میں شامل ہے، ہوا یہ کہ گزرے ہوئے اتوار کے دن میں نے اخبار میں جسٹس کھوسہ کی ایک تقریر کی خبر پڑھی جو انہوں نے لاہور کے ایک لاء کالج میں کی تھی۔ انہوں نے قانون کے طالبعلموں سے کہا کہ ایک اچھے وکیل کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے تاریخ، ریاضی اور ادب پر عبور حاصل ہو۔ اور اس طرح وہ

ایک ہمہ گیر شخصیت بن سکے۔ جسٹس کھوسہ نے کہا کہ یہ دکھ کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں آج کل ہر سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسئلہ بالآخر عدالت کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ گویا ایک وکیل کے علم اور اس کی سمجھ کے دائرے کو کافی وسیع ہونا چاہئے۔ یہاں بھی اس مشق کی گنجائش رہے کہ ایک وکیل کے مطالعے کیلئے آپ کن کتابوں کا انتخاب کریں گے۔ جسٹس کھوسہ نے وکیلوں کے نصاب میں ادب کو جو شامل کیا ہے کہ اس کے بارے میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ میں نوجوانوں سے اپنی گفتگو میں ہمیشہ یہ کہتا ہوں کہ افسانوی ادب اور شاعری کے بغیر ہم ادھورے ہیں۔ ہمارا پیشہ یا کاروبار کچھ بھی ہو، ہمیں خود کو اور اس دنیا کو سمجھنے کیلئے افسانوی ادب کے سہارے کی حاجت ہے۔ میں نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ اگر شاعری نہیں پڑھو گے تو عشق کرنے کے آداب کیسے سیکھو گے۔ کتابوں کے ذکر کا دوسرا حوالہ میرے پاس یہ ہے کہ 2 اپریل کو بچوں کے ادب کا عالمی دن منایا گیا۔ بچوں کی پرورش میں جتنی والدین کے پیار کی اہمیت ہے، اتنی ہی ان کہانیوں کی ہے جو وہ سنتے اور پڑھتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ کسی بھی بڑی قوم کی تخلیق ان خوابوں کی کاشت سے ہوتی ہے جو اس کے بچے دیکھتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اس موضوع کے ساتھ بھی یہاں انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں! ایک مثال مجھے یاد آتی ہے۔ امریکہ کی لائبریری آف کانگریس نے کتابوں کی ایک فہرست بنائی جنہوں نے ملک کی تشکیل کی، اس کے خدوخال متعین کئے۔ سادہ لفظوں میں، وہ کتابیں جنہوں نے امریکہ کو امریکہ بنایا۔ اس فہرست میں 88 کتابیں شامل تھیں اور ان کی ایک خصوصی نمائش بھی منعقد کی گئی۔ یہ ایک انتہائی دلچسپ اور بصیرت افروز فہرست ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں افسانوی ادب بھی نمایاں ہے کہ جو کسی بھی معاشرے کی ذہنی اور جذباتی تربیت میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ فی الحال میں صرف بچوں کی کتاب کا ذکر کر رہا ہوں۔ جی ہاں، ان کتابوں کی فہرست میں کہ جنہوں نے امریکہ کی تشکیل کی، بچوں کے لئے لکھی گئی کئی کہانیوں کی ایک کتاب بھی شامل ہے۔ اس کتاب کا نام ہے ’’گڈ نائٹ مون‘‘۔ آپ اسے ’’شب بخیر چندا ماما‘‘ کہہ لیں۔ یہ کتاب 1947 میں لکھی گئی اور بہت مقبول ہوئی۔ والدین بچوں کو سلاتے وقت اسے پڑھ کر سناتے ہیں۔ اسی قسم کا کام ہماری دادیاں اور نانیاں بھی کیا کرتی تھیں لیکن اب نہ صرف ہمارے بچوں بلکہ ہماری قوم کو کس طرح پالا جا رہا ہے، یہ ایک دوسری کہانی ہے۔

تیونس کی حکومت نے سرکاری عمارتوں میں نقاب پہننے پر پابندی عائد کر دی ہے

تیونس کے وزیر اعظم یوسف الشاہد نے حفاظتی انتظامات کے پیشِ نظر سرکاری دفاتر میں نقاب پہننے پر پابندی عائد کر دی ہے۔

یہ احکامات ملک کے دارالحکومت تیونس میں ایک ہفتے میں ہونے والے تین خودکش دھماکوں کے بعد جاری ہوئے ہیں۔

انسانی حقوق کی تنظیموں نے حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ یہ بات یقینی بنائیں کہ یہ پابندی عارضی ہوگی۔

طویل عرصے تک تیونس پر حکمرانی کرنے والے زین العابدین بن علی نے بھی سرکاری عمارتوں میں حجاب پر پابندی لگائی تھی تاہم 2011 میں ان کی حکومت گرنے کے بعد اس پابندی کو ختم کر دیا گیا تھا۔

جمعہ کو یوسف الشاہد کے دفتر سے جاری کیے گئے اعلامیے میں کہا گیا کہ حفاظتی وجوہات کی بنا پر انتظامیہ اور اداروں (کے دفاتر) میں چہرا ڈھانپنے پر پابندی ہے۔‘

انسانی حقوق کی تنظیم ’دی لیگ آف دی ڈیفینس آف ہیومن رائٹس‘ کے کارکن جمیل مُصلم نے حکومت سے کہا کہ وہ یہ بات یقینی بنائیں کہ پابندی عارضی ہو۔

جمیل مُصلم نے اے ایف پی کو بتایا کہ ’ہم اپنی مرضی کے کپڑے پہننے کے حق کے ساتھ ہیں، لیکن آج کی صورتحال اور تیونس اور خطے میں پھیلے دہشتگردی کے خطرات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں اس فیصلے کے جواز ملتے ہیں۔‘

انھوں نے حکومت سے کہا کہ سکیورٹی حالات نارمل ہوتے ہی اس پابندی کو ختم کر دیا جائے۔

پہلے ایسی پابندی کن ملکوں میں لگ چکی ہے؟

سری لنکا میں اپریل 2013 میں ایسٹر سنڈے کو ہونے والے خودکش حملوں کے بعد عوامی مقامات پر چہرہ ڈھانپنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

فرانس پہلا یورپی ملک ہے جہاں 2011 میں برقعے پر پابندی عائد کی گئی تھی۔ چیلنج کیے جانے کے باوجود اس پابندی کو انسانی حقوق کے یورپی کورٹ نے جولائی سنہ 2014 میں برقرار رکھا۔

ڈنمارک میں جب اگست 2018 میں برقعے پر پابندی عائد کی گئی تو اس کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ وہاں کے قانون کے مطابق جو کوئی بھی ایسا لباس پہنتا ہے جس سے پورا چہرہ چھپ جائے تو اسے ایک ہزار کرونے یعنی 110 ڈالر سے زیادہ (116) کا جرمانہ ہوگا اور اگر دوبارہ ایسا کیا گیا تو جرمانہ دس گنا زیادہ ہوگا۔

(بقیہ صفحہ نمبر 60 ملاحظہ فرمائیں)

بزمِ شاعری

مٹی تھا میں خمیر ترے ناز سے اُٹھا

عبیداللہ علیم

مٹی تھا میں خمیر ترے ناز سے اُٹھا
پھر ہفت آسماں مری پرواز سے اُٹھا
انسان ہو کسی بھی صدی کا کہیں کا ہو
یہ جب اٹھا ضمیر کی آواز سے اُٹھا
صبحِ چمن میں ایک یہی آفتاب تھا
اس آدمی کی لاش کو اعزاز سے اُٹھا
سو کرتبوں سے لکھا گیا ایک ایک لفظ
لیکن یہ جب اُٹھا کسی اعجاز سے اُٹھا
اے شہسوار حُسن یہ دل ہے یہ میرا دل
یہ تیری سر زمیں ہے قدم ناز سے اُٹھا
میں پُوچھ لُوں کہ کیا ہے مرا جبر و اختیار
یا رب یہ مسئلہ کبھی آغاز سے اُٹھا
وہ ابر شبنمی تھا کہ نہلا گیا وجود
میں خواب دیکھتا ہوا الفاظ سے اُٹھا
شاعر کی آنکھ کا وہ ستارہ ہوا علیمؔ
قامت میں جو قیامتی انداز سے اُٹھا

آہ احمد ندیم قاسمی ۔ اپنے استادِ محترم کی یاد میں نذرانہ عقیدت

مبشر شہزاد گلاسگو

یک بیک ویراں ہوئی بزم ادب
اے فلک تو نے کیا یہ کیا غضب
وہ نجوم و مہر سے آگے گیا
چھوڑ کر ہم کو دہر میں غمزدہ
آگہی کی راہ سونی ہوگئی
ظلمتوں میں ساری رونق کھو گئی
فکرو فن کا باغ ویراں ہوگیا
جان اردو نیند گہری سو گیا
اب اسے کیونکر پکارا کیجئے
ہجر کے غم کو گوارا کیجئے
سوئے جنت چل دئے احمد ندیم
کر گئے اہل ادب کو وہ یتیم
یہ مبشر عزم کرنا چاہیے
کام ان کا جاری رہنا چاہیے

رات میں اپنی ہی تصویر سے ڈر جاتا ہوں

خیرالدین اعظم علی گڑھ

ساری دنیا سے تو بے خوف گزر جاتا ہوں
اپنے ہی شہر میں آتے ہوئے ڈر جاتا ہوں
جانے کس طرح کی چلتی ہے کہانی مجھ میں
میں ہی ہر قصے کے آغاز میں مر جاتا ہوں
مجھ میں رہتا ہے کوئی اور بھی میرے جیسا
ہو جو تنہائی تو میں اس میں اتر جاتا ہوں
جمع کرتا ہوں میں دن کے لیے خود کو ہر صبح
اور پھر شام کے ہوتے ہی بکھر جاتا ہوں
مجھ پہ وہ خوف کا عالم ہے کہ اک مدت سے
رات میں اپنی ہی تصویر سے ڈر جاتا ہوں

خوشی کی بات ہے اُس کو معاف میں نے کیا

شفیقؔ رائے پوری چھتیس گڑھ انڈیا

ہمیشہ بیتِ وفا کا طواف میں نے کیا
خطا اُدھر سے ہوئی اعتراف میں نے کیا
مرا ضمیر ہے منصف مجھے سزا دے گا
صداقتوں سے اگر انحراف میں نے کیا
دکھا کے لوگوں کو آئینہ کیا ملا مجھ کو
تمام شہر کو اپنے خلاف میں نے کیا
سزا نہ دے کے سبق دے دیا ستمگر کو
خوشی کی بات ہے اُس کو معاف میں نے کیا
مرا مزاج نہیں ہاں میں ہاں ملانے کا
غلط تھی بات تری اختلاف میں نے کیا
مری خوشی کا وہ قاتل تھا باوجود اِس کے
شفیقؔ اُس کو بھی دل سے معاف میں نے کیا

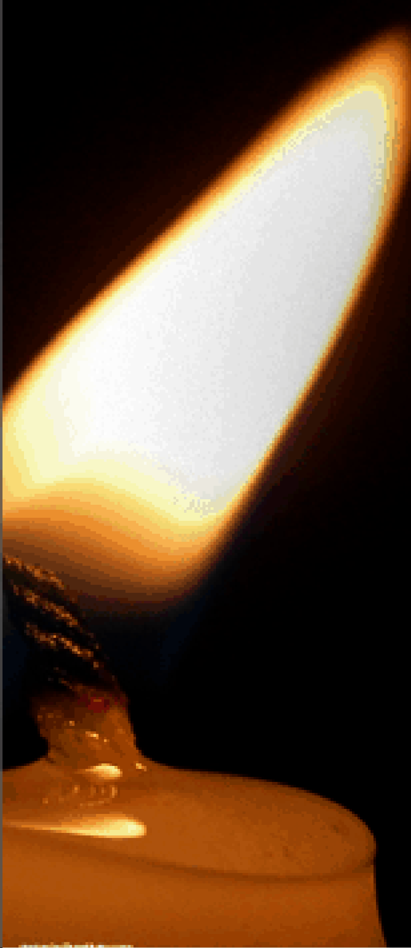

شعر و شاعری

امۃ الباری ناصر

آئی ہے بڑی درد بھری ایک خبر آج
وہ کرب ہے کٹتا ہے مرا قلب و جگر آج
اشکوں پہ مرا آج کوئی ضبط نہیں ہے
جائے گا فلک تک میری آہوں کا اثر آج
خوں خوار درندوں کی طرح ہو گئے انساں
اللہ کا باقی نہ کوئی خوف نہ ڈر آج
یہ دیکھ کہ تم آگے ہوسفاکی میں ان سے
باندھا گیا فرعون کا سہرا ترے سر آج
کچھ ناز کے پالوں پہ لگی مہر یتیمی
ڈوبے ہیں تاریکی میں کچھ نور نظر آج
کل تک جو سہاگن تھی وہ اب ہوگئی بیوہ
جو چل کے گیا 'پاؤں پہ لوٹا نہیں گھر آج
سونی ہوئی اک ماں کی تمناؤں کی دنیا
اک باپ کی بڑھاپے میں ٹوٹی ہے کمر آج
بہنوں کے جگرکٹ گئے رخصت ہوا بھائی
محروم ہوئے سایے سے معصوموں کے سر آج
سفاکوں نے بے دردی سے نوچا ہے کلیجہ
ممکن نہیں قابو میں رہیں دیدہء تر آج
یہ سوچا کہ کچھ بانٹ لوں غم پونچھ کے آنسو
دل تھام کے میں بھی گئی مرحوم کے گھر آج
ہر شخص وہاں پیکرِ تسلیم و رضا تھا
تھا سامنے اک صبر و سکینت کا نگر آج
کس بات کا افسوس مبارک دو کہ ہم ہیں
تکتے ہیں جنہیں رشک سے یہ شمس و قمر آج
ہر شخص کو مرنا ہے مگر دین کی خاطر
مل جائے شہادت کہا ں آتی ہے نظر آج
بن جائے گی ایک ایک قلم باغ ثمردار
کاٹی گئی بے دردی سے جو شاخِ شجر آج
کل قصر محمدؐ ﷺ کی چمک دیدنی ہوگی
بنیاد میں ہم دیں گے اگر لعل و گہر آج
وہ زندہ ہے فرمان ہے یہ زندہ خدا کا
مردہ نہ کہو وہ تو ہوا مر کے امر آج
ہم صبر کریں گے تو خدا پیار کرے گا
راضی برضا رہنے کا سیکھا ہے ہنر آج

طاہرہ زرتشت ناز

میری نُورِ نظر میری جانِ جگر

تیرے آنچل میں تاروں کی جھلمل سجے
تیری زُلفوں میں کلیوں کی خوشبُو بسے
تیرے ماتھے پہ اُلفت کا جُھومر سجے
دِل میں ہمدم کے تیری ہی چاہت بَسے
میری نُورِ نظر میری جانِ جگر
تیری خُوشیوں کو میری لگے نہ نظر
تیرے گُلشن کی ہر ڈال پُھولے پھلے
تُجھ کو دنیا میں جنّت کی نعمت ملے
غم کوئی پاس تیرے نہ پھٹکے کبھی
کانٹا دامن میں تیرے نہ اٹکے کبھی
دِل میں قائم ہمیشہ صداقت رہے
تُجھ کو حاصل خدا کی رفاقت رہے
اُس دِل کی تمہارے نہ ٹوٹے کبھی
ہاتھ سے اُس کا دامن نہ چھوٹے کبھی
دِل میں اُس کی خشیّت ہمیشہ رہے
اُس سے چاہت ، محبّت ہمیشہ رہے
ہونا مایُوس مومن کا شیوہ نہیں
بِن دعا کے مِلا کوئی میوہ نہیں
بے بسوں کا وہ ہوتا ہے خود ہی کفیل
جس کا کوئی نہ ہو اُس کا وہ ہے وکیل
خود یہ قراں میں کہتا ہے مَولا کریم
اُس کی شانِ کریمی ہے سب سے عظیم
مُجھ کو بندہ میرا جب بُلائے کوئی
دَر پہ آئے تو خالی نہ جائے کوئی
کوئی بندہ جو تقوٰی سے ہووے قریب
بڑھ کے آتا ہوں میں! کہہ کے" اِنّی قَریب"
تجھ کو خوشیوں کی برسات دائم ملے
اُس کے فضلوں کی سوغات دائم ملے
نازؔ کی سب دعاؤں کو مَولا سنے
بگڑی سب کی اُسی کے کرم سے بنے

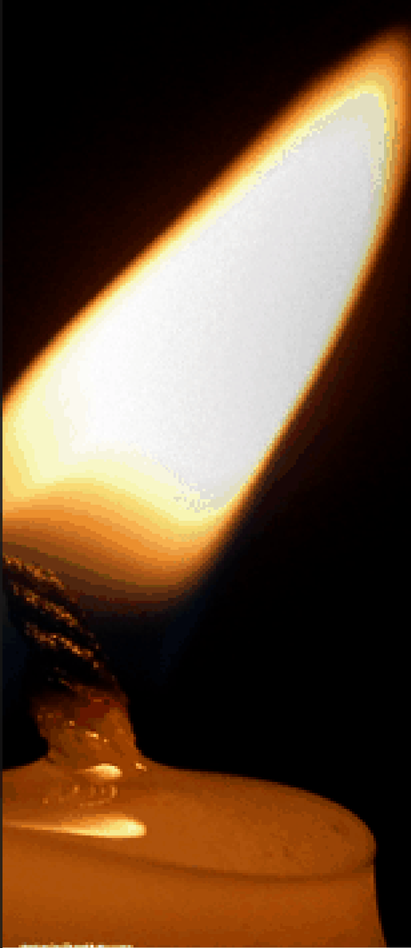

اداسیاں ویرانیاں مرے اندر کی دیکھ کر
مجھے کسی نے بتایا ہے مر گیا ہوں میں

تحریر زیب النساء دہلی

نوید آج گھر سے نکل چکا تھا یہ سوچ کر کہ اب پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گا۔ مگر افسوس اسے مڑنا ہی پڑا۔ کیوں؟ آیئے ذرا اس پر روشنی ڈالیں۔

ایک بڑا معصوم سا بچہ زمین پر درخت سے گرے سوکھے پتوں کو چُنتے ہوئے بڑے خوشنما انداز میں کہہ رہا تھا:

مسکراہٹ تبسم اور قہقہے
سب کے سب کھو گئے ہم بڑے ہو گئے

یہ مصرع دوہراتا جاتا اور زمین پر پڑے پتے اکٹھا کرتا جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پتوں کا ڈھیر گٹھری کا روپ لے چکا تھا۔ اب اس گٹھری کو اپنی ننھی سی پیٹھ پر لاد کر اس جانب چل دیا جدھر اس کا گھر تھا۔ وہ آگے آگے چل رہا تھا اور نوید پیچھے پیچھے۔ جی ہاں، ہم اسی نوید کی بات کر رہے ہیں جس نے تھوڑی دیر پہلے عہد کیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھے گا۔ مگر اسے دیکھنا پڑا، اس دلیر اور معصوم کے حوصلے کو دیکھ کر۔

جانتے ہیں اس بچے کے حوصلے نے ہی نوید کو اس کے پیچھے جانے پر مجبور کر دیا تھا اور اب وہ اس بچے کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے گھر کی قریب تھا۔ اگلا منظر کچھ یوں تھا:

دروازہ کھلا تو سفید لباس میں کھڑی ایک عورت اس سے کچھ یوں بولی ''میرے بچّے! تم نے آنے میں اتنی دیر کر دی۔''

بچے نے مسکرا کر جواب دیا: ''اماں! آج ہوا چلنے کا انتظار کر رہا تھا۔''

ماں نے حیران ہو کر پوچھا: ''وہ کیوں؟''

بچہ بولا: ''اُف اماں! اتنا بھی نہیں جانتیں۔ ارے بھئی، جب تیز ہوا چلے گی تبھی تو درخت کے پتے ٹوٹیں گے اور پھر وہ پتے زمین پر گریں گے۔ سوکھے پتوں سے چولھے کی آنچ بھی تیز اور دیر تک جلے گی اور آپ میرے من مطابق کھانا بھی بنا سکیں گی۔ پسندیدہ کھانا ہوگا تو پیٹ بھر جائے گا، اور پھر پڑھنے میں زیادہ جی لگے گا۔ زیادہ پڑھوں گا لکھوں گا تو ایک دن بابو افسر بن جاؤں گا۔ اور جب کسی بڑے عہدے پر پہنچ جاؤں گا......''

وہ اپنی بات پوری بھی نہ پایا تھا کہ اس کی ماں بیچ ہی میں بول پڑی: ''اُف میرے خدا! اپنی تمناؤں میں تھوڑی تو کمی کر و بیٹا۔ بہر حال ان سب باتوں میں تم ایک بات تو بھول ہی گئے۔''

بچے نے چونک کر پوچھا: ''کون سی؟''

اماں گہری سانس لے کر بولی: ''تم بھلے ہی سب کے حقوق ادا کرو، کتنی ہی کامیابی کیوں نہ حاصل کرو۔ اگر تم نے اللہ کا حق ادا نہ کیا تو سمجھ لو تم راجا ہو کر بھی رنک ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اماں نے آسمان کی جانب دیکھا تو بچہ بول اٹھا: ''اماں! اللہ کا حق کیا ہوتا ہے؟'' یہ ایک معصوم دل میں اٹھنے والا سوال تھا اور اب اس سوال کا جواب ماں نے کچھ یوں دیا:

''بیٹا! اللہ کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ انسان صرف اسی کو خدا مانے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ یہ حق لا الٰہ اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) پر ایمان لانے سے ادا ہوتا ہے۔ اللہ کا دوسرا حق یہ ہے کہ جو ہدایت اس کی طرف سے ہمیں دی گئی ہیں انھیں سچے دل سے تسلیم کیا جائے۔ اللہ کا تیسرا حق یہ ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے۔ یہ حق خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کی پیروی اور اس پر عمل کرنے سے ادا ہوگا۔ چوتھا حق خدا کی عبادت کرنے سے ادا ہوگا۔ اسلامی حقوق کے دو حصے ہیں۔ اللہ کا حق اور دوسرا بندوں کا حق۔ اللہ کا حق دوسرے حق سے اونچا ہے۔

اللہ کے حق کے بارے میں میں تمھیں بتا چکی ہوں۔ اب بندوں کے حق کے بارے میں بتاتی ہوں۔ قرآن میں زیادہ تر بندوں کے حق کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ وہ اپنے تعلقات آپس میں درست رکھیں۔ ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑائیں۔ اور نہ ہی غیبت کریں۔

حقوق کی ایک کڑی والدین کے حقوق کی بھی ہے۔ قرآن نے اس کے بارے میں تاکید کی ہے کہ ''اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔'' یاد

رکھو بیٹا! نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ جس شخص نے اپنے بوڑھے ماں باپ کو پایا اور پھر ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی تو اس کے لیے جنت لازمی ہوگئی۔''

''اوہ اماں! اب تو میں تمھیں تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ تمھاری خوب خدمت کروں گا۔'' معصوم بچے کا یہ سچا جذبہ دیکھ کر اماں نے اپنے آنسو دوپٹے سے پونچھے اور بولی: ''بیٹا! سارے حقوق سے اوپر رَب کریم کا حق ہے۔ بس اسے کبھی نہ بھولنا۔ میری زندگی میں بھی اور میرے مرنے کے بعد بھی۔ ارے ہاں! ایک حق کے بارے میں تو میں بتانا ہی بھول گئی۔ جسے ہم سایے کا حق کہتے ہیں۔''

پھر اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور بولی ''ہم سایے یعنی پڑوسی۔ اسلام میں پڑوسیوں کے زیادہ حق بتائے ہیں۔ ان حقوق کا قرآن میں بھی ذکر ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے تھے کہ ''حضرت جبرئیلؑ مجھے پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں اتنی تاکید کرتے تھے کہ مجھے شک ہوتا تھا کہ انھیں ترکے (وراثت) میں وارث بنا دیا جائے گا۔''

اتنا کہہ کر اماں گہری خاموشی کے ساتھ جا لیٹی اور بچہ اپنی ماں سے لپٹتے ہوئے بولا: ''اماں! تم روز مجھے اسی طرح کچھ نہ کچھ سنایا کرو۔''

اماں نے جواب دیا: ''انشاءاللہ!''

اور اس طرح دونوں ماں بیٹے کی بات چیت ختم ہوئی۔ اُدھر نوید جو بہت دیر سے کھڑا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا، اس نتیجے پر پہنچا کہ سچ ہی تو کہا ہے کہ ماں ہی بچے کی اصل استاد ہوتی ہے۔ اور اس کی گود انسانیت کا پہلا مدرسہ اور اس کی دی ہوئی تربیت پہلی ٹریننگ ہے۔ کاش! میری ماں بھی ایسی ہی ہوتی تو آج میں یوں تنہائی کے جنگل میں نہ بھٹک رہا ہوتا۔

آج اس کے دل میں ایک تڑپ تھی، ایک کسک تھی۔ اور اس کسک میں مُٹھی بھر ممتا کی پیاس بھی شامل تھی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور دل ہی دل میں کہا:

اداسیاں ویرانیاں مرے اندر کی دیکھ کر
مجھے کسی نے بتایا ہے مر گیا ہوں میں

تیونس کی حکومت نے سرکاری عمارتوں میں نقاب پہننے پر پابندی عائد کردی ہے
(بقیہ صفحہ)

نیدرلینڈ کی پارلیمان نے جون 2018 میں عوامی مقامات جیسے سکول، ہسپتال اور پبلک ٹرانسپورٹ میں ایسے لباس پہننے پر پابندی عائد کردی جو پوری طرح سے چہرے کو ڈھانپ دے۔ اگر آپ سڑک پر ہیں تو اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

جرمنی میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے نقاب غیر قانونی ہے۔ جرمنی کے ایوان زیریں نے ججوں، سرکاری ملازمین اور فوجیوں کے لیے جزوی پابندی کی منظوری دے رکھی ہے۔ جو خواتین نقاب کرتی ہیں انھیں بھی شناخت کے لیے اپنے چہرے سے نقاب ہٹانا ضروری ہے۔

بیلجیئم میں برقعے پر جولائی 2011 میں پابندی عائد کرنے کا قانون منظور ہوا۔ اس کے تحت پارک اور سڑک جیسے عوامی مقامات پر ایسے ہر لباس پر پابندی عائد کی گئی جس سے پہننے والے کی شناخت میں دشواری ہو۔

ناروے میں جون 2018 میں ایک بل منظور ہوا جس کے تحت تعلیمی ادارے میں حجاب پہننے پر پابندی عائد کردی گئی۔

بلغاریہ کی پارلیمان نے 2016 میں ایک بل منظور کیا جس کے تحت ان خواتین پر جرمانے اور سرکاری فوائد سے محروم کیے جانے کی بات کہی گئی جو عوامی مقامات پر برقعہ پہنیں۔

لگزمبرگ میں بھی ہسپتال، عدالت، اور سرکاری عمارتوں میں برقعے پر پابندی ہے۔

بعض یورپی ممالک میں مخصوص شہروں اور علاقوں میں پابندی عائد ہے۔

اٹلی بھی اس میں شامل ہے جہاں بہت سے شہروں میں نقاب یا برقعے پر پابندی عائد ہے۔ ان شہروں میں نوارا بھی شامل ہے جہاں پابندی 2010 میں عائد کی گئی تھی۔

سپین کے شہر بارسلونا میں مخصوص مقامات میں برقعے پر 2010 میں پابندی لگائی گئی تھی اور کوئی میونسپل دفاتر، سرکاری بازار اور لائبریریوں میں برقعہ نہیں پہن سکتا۔

سوئٹزرلینڈ کے بعض علاقوں میں بھی برقعے پر پابندی ہے۔

چاڈ، گبون اور کیمرون کے شمالی علاقوں، نائجر کے ڈیفا علاقے اور کانگو جمہوریہ میں برقعے پر 2015 کے حملوں کے بعد پابندی عائد کی گئی تھی۔ ان حملوں میں چند برقعہ پوش خواتین نے علاقے میں کئی جگہ خودکش حملے کیے تھے۔

الجزائر میں سرکاری ملازمین پر برقعہ پہننے پر اکتوبر 2018 سے پابندی عائد ہے۔

چین کے سنکیانگ علاقے میں عوامی مقامات پر برقعہ یا نقاب پہننا یا غیر معمولی طور پر لمبی ڈاڑھی رکھنے پر پابندی ہے۔

سنکیانگ اوغیر مسلمانوں کا آبائی علاقہ ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ ان کے ساتھ وہاں امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔

آدمی عورت سے محبت کرتا ہے جبکہ عورت اولاد سے

لاہور نیوز ڈیسک

اشفاق احمد اکثر کہا کرتے تھے کہ آدمی عورت سے محبت کرتا ہے جبکہ عورت اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے اس بات کی مکمل سمجھ مجھے اس رات آئی یہ گزشتہ صدی کے آخری سال کی موسمِ بہار کی ایک رات تھی۔ میری شادی ہوئے تقریباً دو سال ہو گئے تھے۔ اور بڑا بیٹا قریب ایک برس کا رہا ہوگا۔

اس رات کمرے میں تین لوگ تھے میں میرا بیٹا اور اس کی والدہ! تین میں سے دو لوگوں کو بخار تھا مجھے کوئی ایک سو چار درجہ اور میرے بیٹے کو ایک سو ایک درجہ۔ اگرچہ میری حالت میرے بیٹے سے کہیں زیادہ خراب تھی۔ تاہم میں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے کمرے میں صرف دو ہی لوگ ہیں میرا بیٹا اور اسکی والدہ۔

بری طرح نظرانداز کیے جانے کے احساس نے میرے خیالات کو زیروزبر تو بہت کیا لیکن ادراک کے گھوڑے دوڑانے پر عقدہ یہی کھلا کہ عورت نام ہے اس ہستی کا کہ جب اسکو ممتا ودیعت کر دی جاتی ہے تو اس کو پھر اپنی اولاد کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ اپنا شوہر بھی اور خاص طور پر جب اسکی اولاد کسی مشکل میں ہو۔ اس نتیجہ کے ساتھ ہی ایک نتیجہ اور بھی نکالا میں نے اور وہ یہ کہ اگر میرے بیٹے کے درد کا درمان اسکی کی والدہ کی آغوش ہے تو یقیناً میرا علاج میری ماں کی آغوش ہوگی۔

اس خیال کا آنا تھا کہ میں بستر سے اٹھا اور ماں جی کے کمرہ کی طرف چل پڑا۔ رات کے دو بجے تھے پر جونہی میں نے انکے کمرے کا دروازہ کھولا وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئیں جیسے میرا ہی انتظار کر رہی ہوں۔ پھر کیا تھا بالکل ایک سال کے بچے کی طرح گود میں لے لیا۔ اور توجہ اور محبت کی اتنی ہیوی ڈوز سے میری آغوش تھراپی کی کہ میں صبح تک بالکل بھلا چنگا ہو گیا۔

پھر تو جیسے میں نے اصول ہی بنا لیا جب کبھی کسی چھوٹے بڑے مسئلے یا بیماری کا شکار ہوتا کسی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس جانے کی بجائے سیدھا مرکزی ممتا شفا خانہ برائے توجہ اور علاج میں پہنچ جاتا۔ وہاں پہنچ کر مُجھے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ بس میری شکل دیکھ کر ہی مسئلہ کی سنگینی کا اندازہ لگا لیا جاتا۔ میڈیکل ایمرجنسی ڈیکلئر کر دی جاتی۔ مجھے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ (ماں جی) کے ہی بستر پر لٹا دیا جاتا اور انکا ہی کمبل اوڑھا دیا جاتا کسی کو یخنی کا حکم ہوتا تو کسی کو دودھ لانے کا خاندانی معالج کی ہنگامی طلبی ہوتی الغرض توجہ اور محبت کی اسی ہیوی ڈوز سے آغوش تھراپی ہوتی اور میں بیماری کی نوعیت کے حساب سے کبھی چند گھنٹوں اور کبھی چند پہروں میں روبہ صحت ہو کر ڈسچارج کر دیا جاتا۔

یہ سلسلہ تقریباً تین ماہ قبل تک جاری رہا۔ وہ وسط نومبر کی ایک خنک شام تھی جب میں فیکٹری سے گھر کیلئے روانہ ہونے لگا تو مجھے لگا کہ مکمل طور پر صحتمند نہیں ہوں تبھی میں نے آغوش تھراپی کروانے کا فیصلہ کیا اور گھر جانے کی بجائے ماں جی کی خدمت میں حاضر ہو گیا لیکن وہاں پہنچنے پر اور ہی منظر دیکھنے کو ملا۔ ماں جی کی اپنی حالت کافی ناگفتہ بہ تھی پچھلے کئی روز سے چل رہے پھیپھڑوں کے عارضہ کے باعث بخار اور درد کا دور چل رہا تھا۔

میں خود کو بھول کر انکی تیمارداری میں جت گیا مختلف ادویات دیں خوراک کے معروف ٹوٹکے آزمائے۔ مٹھی چاپی کی مختصر یہ کہ کوئی دو گھنٹے کی آؤ بھگت کے بعد انکی طبیعت سنبھلی اور وہ سو گئیں۔ میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔ ابھی گھر پہنچے آدھ گھنٹہ ہی بمشکل گذرا ہوگا کہ فون کی گھنٹی بجی دیکھا تو چھوٹے بھائی کا نمبر تھا سو طرح کے واہمے ایک پل میں آ کر گزر گئے۔ جھٹ سے فون اٹھایا اور چھوٹتے ہی پوچھا بھائی سب خیریت ہے نا بھائی بولا سب خیریت ہے وہ اصل میں ماں جی پوچھ رہی ہیں کہ آپکی طبیعت ناساز تھی اب کیسی ہے۔

وہ میرے خدایا!

اس روز میرے ذہن میں ماں کی تعریف مکمل ہو گئی تھی۔ ماں وہ ہستی ہے جو اولاد کو تکلیف میں دیکھ کر اپنا دکھ اپنا آپ بھی بھول جاتی ہے۔

آج ماں جی کو رحمان کی رحمت میں گئے ایک ماہ اور آٹھ روز ہو گئے ہیں۔ آج مجھے پھر بخار ہوا ہے آغوش تھراپی کی اشد ضرورت ہے۔ پر میرا مرکزی ممتا شفا خانہ برائے توجہ اور علاج ہمیشہ کیلئے بند ہو چکا ہے۔ مجھے آپ دوستوں سے راہنمائی درکار ہے۔ اب بھلا میں کیسے ٹھیک ہونگا؟

عشق بے کار نہیں

تحریر بشریٰ بختیار خان

کسی سے ملنے سے قبل خود سے ملنا ضروری ہے اور کسی سے پیار کرنے سے قبل خود سے پیار کرنا ضروری ہے. جس کو اپنا آپ سونپا جا رہا ہو اسے جاننے سمجھنے اور اپنانے سے پہلے اپنے آپ کو جاننا سمجھنا اور اپنانا بے حد ضروری ہے، کسی سے دل لگانے سے قبل خود سے دل لگانا کسی کے بارے میں سوچنے سے قبل اپنے بارے میں سوچنا جس قدر ضروری ہے شاید کچھ ضروری نہیں، یہی کامیاب محبت اور کامیاب رشتوں کی ضرورت ہے، جس کسی کو پیار دے رہے ہیں جس کسی کو اپنا آپ سونپ رہے ہیں کم سے کم یہ تو معلوم ہو کہ اُسے کیا سونپ رہے ہیں اُسے کیا دے رہے ہیں اور اُس کے بدلے میں کیا لینا چاہیے، کیا نہیں لینا چاہیے، کیا وہ اس قابل ہے کہ اُسے اپنا آپ سونپا جائے، کیا وہ اس سے زیادہ کا حق دار تو نہیں، کیا وہ آپ کو سمجھتا ہے کیا وہ آپ کی اہمیت کو سمجھتا ہے اور کیا آپ اُس کی اہمیت کو سمجھتے ہیں، کیا دیا اور کیا لیا جا رہا ہے، کسی اور سے اپنی اہمیت منوانے سے قبل اپنی اہمیت کا خود کو اندازہ ہونا زیادہ ضروری ہے تب ہی آپ شاید کچھ بہتر مطالبہ کر سکیں۔

عشق محبت اور جنون تو بہت بعد کی باتیں ہیں، شدت سے پیار کے بھنور میں پھنسنے والے بھی کچھ عرصہ ساتھ رہ کر ایک دوسرے سے تنگ آجاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رشتہ یہ بندھن صرف بوجھ ہے اور پھر دونوں ساتھ ساتھ تو چلتے ہیں لیکن دریا کے دو کناروں کی طرح جن کا ساتھ چلنا مجبوری تو ہوتا ہے لیکن قربت کا جواز نہیں رہتا، پیار محبت ویسے تو سب باتیں ہیں سمجھی جاتی ہیں لیکن اگر ان پہ یقین کر ہی لیا جائے تو مضائقہ کیا ہے، کیفیت کسی بھی طرح کی ہو انسان کو اپنے اندر جکڑ ضرور لیتی ہے اور اگر پیار کی کیفیت انسان کو مثبت سوچنے کا درس دے تو اس میں برائی نہیں، کبھی کبھی کچھ باتوں پہ یقین نہ بھی ہو تو بھی ان کو مان لینے سے بہت کچھ تبدیلی نظر آتی ہے اور وہ پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کو سلجھانے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہیں لیکن ہم صرف اپنے آپ کو صرف انا کی نظر سے دیکھتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے اندر کا احساس ہمارے لیے برائے نام بھی موجود نہیں رہتا۔

روٹھ جانا آسان سہی لیکن تکلیف دہ بھی ہے اور بغیر اہمیت اور احساس دلائے مان جانا بھی مستقبل کو مزید آزمائشوں میں ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے، روٹھ کر پھر روٹھے رہنے والے بعض اوقات ہمیشہ کے لیے تنہا ہو جاتے ہیں اور بہت جلد مان جانے والے بھی زیادہ دیر راضی نہیں رہ سکتے، خوف اور خواہش دونوں عجیب کیفیات ہیں کہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے سے ہی توازن پیدا ہوتا ہے، پیار کے رشتوں میں ٹوٹ جانے کا خوف بھی ہونا چاہیے اور دور جانے کا خوف بھی لیکن ان دونوں کو کبھی بھی تعبیر نہ ہی ملے، خواہش کسی بھی روح کو جسم کی شکل تو دے دیتی ہے لیکن اُسے فنا کی راہ پہ بھی ڈال دیتی ہے کہ اُسے جلد مٹ جانا پڑتا ہے۔

کسی سے پیار کرنے سے پہلے سوچنے والے ذہن کے غلام نہیں بے وقوف ہوتے ہیں اور پیار کرنے کے بعد نہ سوچنے والے جلد بے زار ہو جاتے ہیں، تنگ راستے پہ چلتے ہوئے ہاتھ تھام کر چلنا زیادہ مشکل ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے پیچھے چلنا جلد اس تنگی سے نکال دیتا ہے، جب کہیں محسوس ہو کہ مری وجہ سے مرے ساتھی کو تنگی محسوس ہو رہی ہے تو اس کے پیچھے چلو اور دیکھو کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے اس کی سنو کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اسے دیکھو کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے اسے خود سے دور نہ کرو بلکہ اس کے قریب جانا کچھ عرصے کے لیے معطل کر دو شاید وہ آپ کو اپنے آپ میں نہ پا کر آپ کی سمت دوبارہ لوٹ آئے اور ایسے لوٹ کر آنے والے دوبارہ جایا نہیں کرتے۔

کوئی بھی لمحہ ضائع نہ جانے دیں، کوئی بھی تعلق بے زار نہ ہونے دیں، سب جگہ سبھی وقت پیار اور عشق کی تلاش جاری رکھیں، پھول کی پتیوں میں، بارش کی بوندوں میں، پرانے خطوں میں، بند کواڑوں میں، راہ کے پتھروں میں، آنکھ کے پانی میں، جھیل کی خاموشی میں، دیوار کی بے زبانی میں، چاند کی روشنی میں، درد کی شدت میں، پیار کے لمحوں میں، وصل کے خوابوں میں، رات کی رانی میں، شام کی اداسی میں، بکھرے ہوئے بالوں میں، ہاتھ کی لکیروں میں، خاک کے پتلوں میں، بے گھر پرندوں میں، کٹتے ہوئے درختوں میں اور پیار کرنے والوں میں اپنوں اور غیروں میں سارے بے وفاؤں میں عشق کی تلاش جاری رکھیں۔

SAAMS FUNCTION HALL
Catering & Event Management

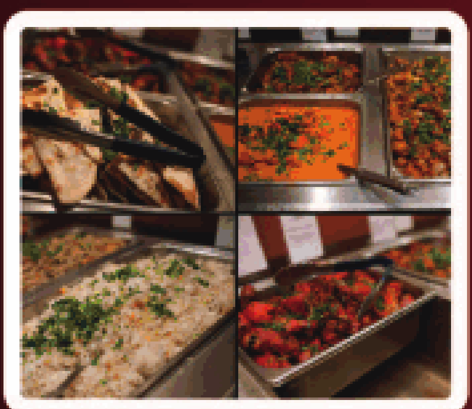

Services Available

- Catering Service
- Special Events
- Corporate Event
- Linen
- Crockery
- Cutlery
- Fresh Flowers
- Drinks
- Stages Decore
- Barbecue Hire

Enquire for a Booking

We Take reservations Everyday

We also provide live Barbecue Function services in your Garden or Our Garden please inquire for details

Catering to your requirments
Cell:07883 815195

Mob:07883 815195 (Khalid Mahmood)

Mob: 07506 952105 (Naeem Chatha)

6-12 London Road Morden London

SM4 5BQ

Tel: 020 8640 0700

Email: saamshalluk@gmail.com

www.saamshall.co.pk

Under New Management
Newly Refurbished function Hall